APRIL 2024 شوال المکرم ۱۴۴۵ھ

ماہنامہ مظاہر علوم
سہارنپور



دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

مدرسہ مظاہر علوم کا ترجمان

ماہنامہ

مظاہر علوم

سہارنپور

جلد نمبر ۲۹

شمارہ نمبر ۱۲

بابت

شوال المکرم — ۱۴۴۵ھ

اپریل — ۲۰۲۴ء

زر تعاون

فی شمارہ — ۳۰ روپے

سالانہ زرتعاون — ۳۰۰ روپے

بیرون ملک سالانہ — ۲۵ ڈالر

مدیر مسئول

حضرت مولانا سید محمد عاقل مدظلہ ناظم مدرسہ

نگران

مولانا مفتی محمد سید صالح الحسنی امین عام مدرسہ

مدیر تحریر

مولانا عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور ۲۴۷۰۰۱ (یوپی)

MAZAHIR ULOOM MONTHLY MAGAZINE

SAHARANPUR 247001(U.P.) INDIA

Ph: 0132-2655542

Email-jamiamazahir@gmail.com

اس شمارے میں

○ دائرہ کا سرخ نشان آپ کی مدت خریداری ختم ہونے کی علامت ہے، آئندہ کے لیے رقم ارسال فرمائیں۔

☆ شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ جواب طلب امور کے لیے لفافہ اور خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ ماہنامہ، انگریزی ماہ کی ۲/تاریخ کو حوالہ ڈاک کردیا جاتا ہے۔ ۱۰/تاریخ تک موصول نہ ہونے پر مطلع فرمائیں۔

نوائے سحر

روزہ اور حج ایک روحانی مناسبت

عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

ماہ اپریل کا یہ شمارہ جس وقت آپ حضرات کے ہاتھوں میں پہونچے گا، شاید نور ونکہت، رحمت ومغفرت اور ربانی نوازشات وعنایات سے معمور ماہ مبارک فرزندان توحید گزار کر اسلامی عظمت وشوکت اور ایمانی اخوت ومحبت کا تہوار عید الفطر منا کر فارغ ہو چکے ہوں گے۔

لیکن کیا رمضان کی عبادت وتلاوت اور شب بیداری، اذکار واوراد صرف ایک ماہ کے لئے مختص ہوتے ہیں، یا رمضان المبارک کے روزوں کے ذریعہ پورے ایک سال کی ایمانی وروحانی تربیت مقصود ہے، یہ نکتہ ہم سب کو دعوت فکر وتدبر دیتا ہے۔ آج ہم اس نوائے سحر میں اسی نکتہ کو سامنے رکھ کر آپ سے مخاطب ہیں۔

روزہ اور حج اسلام کے دو اہم اور عظیم الشان رکن ہیں، روزہ صبر وضبط اور تحمل وبرداشت کا سبق دیتا ہے اور بھوک وپیاس گوارہ کر کے خواہشات نفس کو توڑنے اور شہوانی وحیوانی جذبات کو سرد کرنے کی تربیت دیتا ہے تاکہ قلب مومن جو دراصل نور ایمانی کا مرکز ومحور ہے، تمام عملی وفکری آلائشوں، نجاستوں سے پاک ہو کر قلب سلیم بن جائے، انسان کے اندر ملکوتی صفات پیدا ہو جائیں، دل میں خشیت الٰہی اور تقویٰ اللہ جم جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں روزہ کی یہی غرض وغایت بتائی ہے

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔

اے ایمان والو! تم پر روزہ ایسے فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے قبل امتوں پر فرض کیا گیا تا کہ تقویٰ اختیار کرو۔

لعلکم تتقون پر خاص طور سے غور فرمایا جائے کہ روزہ کا مقصد نہ بھوکا پیاسا رکھنا ہے، نہ بیوی سے شرعی جائز تعلق قائم کرنے سے روکنا ہے، بلکہ نفس امارہ کو کمزور کر کے نفس مطمئنہ بنانا ہے، تاکہ انسان کسی بھی لمحہ اپنے مالک وخالق رب العالمین کی الوہیت ووحدانیت، عظمت وجلالت اور قدرت وطاقت کے

ادراک سے غافل نہ رہے، جب بھی کوئی عمل کرے یا قدم اٹھائے اس کے پیش نظر رب العالمین کی اطاعت وفرمانبرداری ہو،جس طرح رمضان کے مبارک ایام میں بندہ خداتمام منہیات سے اجتناب کرتارہا، قرآن کی تلاوت کااہتمام اورصبروتحمل کاالتزام کرتارہا، یہ وصف رمضان کے بعدبھی باقی رکھنا ہے، ان تمام اعمال سے خود کوبچاناہے جودل کے صاف وشفاف آئینہ کو دھندلاکرنے والے ہیں،معاصی وسیئات کے ارتکاب سے خود کوروکنا ہے،زبان کوفحش گوئی ، کذب بیانی اورسب وشتم سے روکنا ہے،جس سے ایک ماہ مسلسل آیات اللہ کی تلاوت کامعمول بنارکھا تھااور یہ سب اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم رمضان المبارک میں کئے تمام محاسن واعمال کی پابندی جاری رکھیں گے۔

ماہ رمضان کے ختم ہوتے ہی شوال المکرم کامہینہ شروع ہوجاتا ہے جس سے اشہرالحج کی ابتداء ہوجاتی ہے،شوال سے حجاج کرام کے وفودوکارواں بیت اللہ شریف کاقصد کرنے لگتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا ہے **الحج اشھر معلومات فمن فرض فیھن الحج فلا رفث ولافسوق ولاجدال وماتعفلو من خیر یعلمہ اللہ وتزودوا فان خیر الزاد التقویٰ واتقون یااولی الالباب۔** (البقرہ۱۹۷)

حج چند معلوم مہینے (شوال، ذوالقعدہ اورذوالحجہ) ہیں توجس نے بھی ان میں (احرام باندھ کر اپنے اوپر حج فرض کرلیا تووہ کسی طرح کی فحش حرکت نہ کرے، نہ فسق وفجور کامرتکب ہو، نہ ہی کسی سے لڑائی جھگڑا کرے اورتم جوبھی اچھا کام کروگے اللہ اس کوجانتا ہے اورزادراہ لےلو،بہترین زادراہ تقویٰ ہے اوراے عقل والومجھ سے ڈرتے رہو۔

دیکھئے ایک حاجی کوکن امور کے ارتکاب سے منع کیا گیااورکیا کرنے کو کہا گیا ہے یہ وہی اعمال ہیں،روزہ رکھوا کررمضان میں جس کی مشق کرائی گئی،رفث کے معنی مفسرین کے یہاں بیوی سے جماع کرنا ہے، حالت احرام میں بیوی سے صحبت ممنوع ہے،روزہ رکھوا کرزبان کوبدگوئی ، کذب بیانی اورگالی گلوچ سے محفوظ رکھنے کی مشق کرائی گئی، ولافسوق فرما کراس جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ حالت احرام میں زبان پرقابورکھنا،گالی گلوچ سے بچناضروری ہے،کثرت سے تلبیہ پڑھنے کی تاکید کی گئی اورجدال فرما کر یہ بتایا گیا ہے زبانی لڑائی جھگڑے سے بچنا،کسی کی ایذارسانی سے دوررہناایک محرم کے لئے لازم ہے،روزہ کے بارے میں بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے روزہ رکھ کرجھوٹی گواہی ، بہتان تراشی، کذب بیانی کونہیں چھوڑا اورخود کوان سے دورنہیں رکھا تواللہ کوایسے لوگوں کے روزوں سے کوئی

سروکار نہیں کہ وہ صرف کھانا پینا چھوڑ دیں (بخاری) اور یہ بھی فرمایا کہ روزہ کے دنوں میں کوئی تم سے لڑے جھگڑے تو کہہ دو بھائی میں روزہ دار ہوں۔

روزہ اور حج میں ایک خاص ربط ہے، دونوں میں ایک روحانی مناسبت ہے، رمضان کو شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) فرمایا گیا ہے تو حج عشق الٰہی کا مظہر ہے، رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھوا کر قلب مومن کو اس قدر طاقتور بنا دیا ہے کہ وہ بیت اللہ کے دامن میں جب احرام کی حالت پہونچے تو اس کا دل ان نورانی شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرلے جو ہر آن بیت اللہ شریف پر پڑتی ہیں، بیت اللہ جلوہ گاہ رب العالمین ہے سرزمین مکہ انوار و برکات کا منبع و سرچشمہ ہے۔

حج بیت اللہ کی سعادت پانے والوں کو اللہ رب العزت نومولود بچے کی طرح گناہوں سے پاک کر کے واپس بھیجتا ہے، ایک تو روزہ نے تمام میل و گندگی سے دل کو پاک کر کے منور کر دیا تھا، حج کے ذریعہ مزید اس میں نورانیت اور تقویٰ و خشیت پیدا کر دی جاتی ہے۔

حج: اطاعت و بندگی، وحدت و مساوات اور فروتنی و بےنفسی کی علامت ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہماری زندگی کی وہ تبدیلی جو روزہ کی برکت سے ہم میں پیدا ہوئی ہے، وہ باقی رہے اور ہماری ہر سانس میں ایمان کی خوشبو رچ بس جائے۔

فضلائے مدارس سے

آج بڑے شد و مد کے ساتھ یہ واویلا اور شور کیا جاتا ہے کہ مدارس اسلامیہ جو افراد تیار کر رہے ہیں وہ معاشرہ میں اپنا صالح کردار نہیں پیش کر رہے ہیں، امت کو ان فضلاء مدارس سے جو توقعات ہیں وہ ان میں پورے نہیں اتر پا رہے ہیں، ماضی میں مدارس اسلامیہ نے جو معاشرتی استحکام اور قوم و ملت کے وقار و افتخار میں جو شاندار اضافہ کیا ہے وہ اب ان نئے فضلاء مدارس کے ذریعہ نہیں ہو رہا ہے۔

کہنے والوں کی یہ بات کتنی درست ہے اور اس میں حقیقت کا کتنا عنصر ہے یا سب افسانہ ہی افسانہ ہے یہ ایک الگ موضوع ہے تاہم یہ بات واضح ہے کہ اگر مدارس میں خود احتسابی کا عنصر باقی ہو اور اپنی کمزوریوں کے ادراک اور تدارک میں تساہل نہ برتا جائے تو اس کے امتیاز اور نظریہ کو دنیا کی کوئی طاقت بہ زور ختم نہیں کر سکتی اور ان اداروں کی پروردہ آئندہ نسلیں ماضی سے زیادہ میدان سنبھالنے کی اہل ہوں گی۔

مدارس دینیہ سے ابھی ابھی فضلاء کی ایک بڑی تعداد نکلی ہے، ماحول اور معاشرہ میں اپنا مقام ومرتبہ اور علمی وقار پیدا کرنے کے لئے فضلاء کی یہ جماعت ابھی منصوبہ سازی میں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خدمت میں چند گذارشات پیش کی جائیں، امید ہے کہ ان کی اہمیت محسوس کی جائے گی۔

ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں یہ اپنی روح کے اعتبار سے اسلامی نہیں، اسلامی اقدار: دیانت ،امانت، فرض شناسی، حیا، عدل وانصاف اور ایثار ومروت وغیرہ کی معاشرتی اور ملکی سطح پر پامالی مُشاہَدہے، اس لئے روحانی اقدار کو غلبہ دیا جائے جس سے عصر جدید کے مادی وحسی تمدن سے مقابلہ کے لیے عمل کی وہ قوت حاصل کی جاسکتی ہے جو مدرسہ سے حاصل شدہ علم کے عین مطابق ہوگی، لیکن اس ماحول میں فاضل کے لیے اپنے علم (قرآن وحدیث) اور عمل کے اندر کامل مطابقت پیدا کرنا انتہائی ضروری ہے۔

ہمارے فاضل کو معاشرہ میں اپنا مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے علم وعمل کی مطابقت کا جو معرکہ سر کرنا ہے اس کا واحد ذریعہ "تزکیۂ باطن" ہے، سنت اللہ یہی ہے کہ اس کا حصول اہل اللہ کی صحبت کے بغیر مشکل ہے۔

جدید فاضل کے لیے بہترین علمی صلاحیت کی افزائش کے ساتھ اپنے اندر "داعیانہ صفات" کی تشکیل بھی ازحد ضروری ہے، داعی میں جس لگن، محنت، تڑپ اور فکر کا پایا جانا ضروری ہے، عموماً ہم اس سے محروم رہتے ہیں۔

اس وقت علمی وعملی فتنوں کی بہتات ہے، نئے فضلاء مدارس کے سامنے آئے دن نئے نئے افکار وخیالات آئیں گے، ان فتنوں سے بچاؤ کا واحد راستہ جمہور سلف کے فہم دین پر اعتماد ہے۔

اکابر ومشائخ پر مکمل اعتماد رکھیں اور اختلافی مسائل میں جمہور امت کا دامن نہ چھوڑیں۔

اکابر کے ساتھ کسی مسئلہ میں رائے کا اختلاف ہو تو اپنی رائے پر اکابر کی رائے کو ترجیح دیں، اس وقت سلف بیزاری کی مسموم فضاء زوروں پر ہے ہر شخص اپنی تحقیق کا پٹارا کھولے ڈگڈگی بجا رہا ہے، اس لیے اہل حق علماء سے رشتہ مضبوط رکھیں اور فکری ،اعتقادی، فقہی مسائل میں نئی آراء کو داخل کرنے کے بجائے اکابر کی تحقیقات پر یقین رکھیں۔

دینی مدارس میں علومِ نبوت کے حصول کے بعد معمولاتِ نبوت کے حصول کے لیے خانقاہوں

میں اہل اللہ کی صحبت میں کچھ وقت ضرور گزاریں۔

❁ اگر آپ محقق، سکہ بند، پختہ علم اور بالغ نظر عالم بننے کے خواہاں ہیں تو تشدد کی بجائے تسدّ د اور تعصب کی بجائے تصلّب والا مزاج بنائیں۔

❁ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ معاشرہ میں مولوی کا مقام زوال پذیر ہے، اس کا ایک بڑا سبب ہمارے طبقہ میں دینی کاموں کی ترقی کے لئے معاشرہ سے ''مالی طمع'' کا تعلق ہے، جبکہ علم اور مالی طمع کا باہم کوئی جوڑ نہیں اور اسی جوڑ کو قائم کرنے کی کوشش ذلت وخواری سے دوچار کردیتی ہے، دینی کاموں کا دائرہ اتنا ہی رکھنا چاہیے جس کے لیے اپنے منصب کے وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے وسائل مہیا کیے جاسکیں۔

❁ فضلائے مدارس کو اپنے مقام ومرتبہ کے حصول کے لیے معاشرہ اور متعلقین سے توقعات رکھنا بھی زیب نہیں دیتا، اس طرح کا جذبہ رکھنے والے ہر وقت اس خوف کا شکار رہتے ہیں کہ کہیں ان کی ''مقبولیت'' کم یا متاثر نہ ہو، ایسے لوگ اپنے اور معاشرہ کے درمیان خلیجوں کو جنم دیتے ہیں، وہ اکابر علماء کے احترام ومقام کو تو دیکھتے ہیں لیکن اس کی پشت پر طویل مجاہدات کو نہیں دیکھتے، ان کی حالیہ زندگی دیکھ کر ان کی نقالی شروع کردینا کم ظرفی کی علامت ہے۔

معاشرہ کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کے لئے عزم پیہم اور جہدِ مسلسل سے گزرنا ہوگا، یہ داستانِ عزم ووفا بڑی دشوار گزار قربانیوں کی متقاضی ہے، جب تک اس مشن کے حامل ووارث، علم وعمل سے مزین ہوکر مخلصانہ مساعی بروئے کار نہیں لائیں گے، اس وقت تک اُنہیں مطلوبہ نتائج کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔

یوں بھی کوئی شخص محض تعلیم سے ہی انبیاء کی وراثت پر فائز نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کیلئے خصوصی مجاہدہ اور تربیت کی ضرورت ہے، اس لحاظ سے فضلائے مدارس کو اپنی اعلیٰ ترین منزل کیلئے اپنے علم وشعور اور اخلاق وکردار کو بہتر سے بہترین کرنا ہوگا اور اس جادۂ حق کے رہ نورد بن کر عظیم ترین منزل کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول!
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!

درسِ قرآن

معاف کردینا زیادہ بہتر ہے

ازافادات حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

لَایُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیْعاً عَلِیْماً۔ اِنْ تُبْدُوْا خَیْراً اَوْ تُخْفُوْہُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْراً

اللہ تعالیٰ بری بات زبان پرلانے کو پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے اور اللہ خوب سنتے ہیں خوب جانتے ہیں۔ اگر نیک کام علانیہ کرو، یا اس کو خفیہ کرو، یا کسی برائی کو معاف کردو تو اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے ہیں پوری قدرت والے ہیں۔

برائی وایذاء کی شکایت کی حدود

گذشتہ آیات میں منافقین کے احوال میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ عداوت کرنا مذکور ہوا تھا۔ چونکہ عداوت میں اکثر ایذا رسانی کی نوبت بھی آتی رہتی ہے اور جس کو ایذاء پہنچتی ہے اکثر اس کی زبان سے شکوہ شکایت بھی ہوجاتی ہے۔ اس لئے آگے ان آیات میں حکایت وشکایت کے حدود پر گفتگو فرمائی جاتی ہے اور ایک ایسا قانون بتلایا جاتا ہے کہ جس میں ایک طرف تو اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ جس شخص پر کوئی ظلم کرے تو مظلوم اس کے ظلم کی شکایت کرسکتا ہے یا عدالت میں چارہ جوئی کرسکتا ہے جو عین عدل وانصاف کا تقاضا اور انسداد جرائم کا ایک ذریعہ ہے۔ دوسری طرف اعلیٰ اخلاق کی تعلیم اور عفو ودرگزر کی تلقین وترغیب دی جاتی ہے اور مظلوم کو اس پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے حق میں ایثار سے کام لے اور ظلم کا انتقام نہ لے بلکہ عفو ودرگزر کی نیکی اختیار کرے۔

یہاں آیت میں اگرچہ صرف ظالم کے مقابلہ میں شکایت اور اظہار کی اجازت ہے مگر ظالم کے علاوہ بعض اور مواقع بھی ہیں جن میں شریعت برائی کے اظہار کی اجازت دیتی ہے مثلاً اگر کسی سے دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ ہو تو اس کے حالات سے لوگوں کو باخبر کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوگا اسی طرح شہادت میں جو سچی بات ہو اس کا اظہار کرنا واجب ہے خواہ اس میں کسی کی برائی کا اظہار ہو۔ ہاں جہاں کوئی شرعی

مصلحت اور ضرورت نہ ہو وہاں کسی کی عیب جوئی جائز نہیں۔

الغرض حق تعالیٰ نے ان آیات میں تین مرتبے بیان فرمائے۔

اوّل یہ کہ انتقام جائز ہے اور یہ ضعفاء کی شان ہے۔

دوسرے یہ کہ معاف کر دینا یہ اہل ہمت کی شان ہے۔

تیسرے یہ کہ برائی کرنے والے سے سلوک اور احسان یہ اہل عزم اور کاملین کا مقام ہے۔

عفو و درگزر کی ترغیب

آیت کے آخیر میں فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْراً فرما کر یہ بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ قادر مطلق ہیں جس کو جو چاہیں سزا دے سکتے ہیں، اس کے باوجود بہت معاف کرنے والے ہیں، اکثر خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں، تو انسان جس کو قدرت و اختیار بھی کچھ نہیں وہ اگر انتقام لینا بھی چاہے تو بہت ممکن ہے اس پر قدرت ہی نہ ہو، اس لئے اس کو تو عفو و درگزر اور بھی زیادہ مناسب ہے۔

اس طرح دنیا سے ظلم و جور مٹانے کا قرآن کریم نے ایک بہترین قانون تعلیم فرما دیا کہ ایک طرف برابر کے انتقام کا حق دے کر عدل و انصاف کو بھی قائم رکھا اور دوسری طرف مظلوم کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دے کر عفو و درگزر پر آمادہ کیا جس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جس کو قرآن پاک نے ۲۴ ویں پارہ سورۂ حٰم سجدہ میں فرمایا فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ تو پھر یہ ہوگا کہ جس شخص میں اور تم میں عداوت ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی ولی دوست ہوتا ہے۔

الحاصل یہاں آیات میں عام حکم کسی کی غیبت، بدگوئی کرنے کی ممانعت کا ہے۔ البتہ مظلوم کو بقدر ظلم ظالم کی شکایت کرنے، اس سے انتقام لینے اس کو بددعا دینے کی اجازت ہے مگر پھر بھی حلم، درگزر اور عفو کی ترغیب دی گئی ہے۔

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو ظلم سے ہر طرح محفوظ رکھیں اور ہم کو ہر حال میں قرآنی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم میں عفو و درگزر کرنے کی صفات پیدا فرمائیں اور ایک دوسرے کی عیب جوئی اور بدگوئی سے کامل طور پر بچائیں۔ آمین

انوارِ حدیث

کمالِ ایمان کے چار اوصاف

خطاب: مولانا ضیاء الدین صاحب قاسمی ندوی، خیر آبادی

ضبط وترتیب: (عالمہ) ناجیہ زہوا زاہداتی بنت مولانا ضیاء الدین صاحب قاسمی، ندوی خیر آباد/ مئو

فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم :مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَ أَبْغَضَ لِلّٰهِ وَ أَعْطَى لِلّٰهِ وَ مَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ۔ (رواہ أبو داوٗد فی کتاب الایمان)

ابو داوٗد شریف کی اس حدیث میں چار چیزیں (اللہ کے لئے محبت کرنا، اللہ کے لئے بغض رکھنا، اللہ کے لئے کسی کو کچھ دینا، اللہ کے لئے کسی کو کچھ دینے سے رک جانا) بیان کی گئی ہیں اور ان چار چیزوں کے بارے میں اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اگر ان چار چیزوں پر کوئی عمل کرے گا تو کمالِ ایمان کی صفت اس کے اندر پیدا ہوگئی۔

انسان کی فطرت ہے محبت کرنا، اللہ نے انسانی فطرت میں محبت رکھی ہے، ہر مخلوق میں اللہ نے محبت رکھی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت رکھتا ہے، محبت کرنا اللہ کا وصف ہے۔ **ان اللہ یحب الصابرین۔ ان اللہ یحب المتقین، ان اللہ یحب المتوکلین، ان اللہ یحب التوابین۔** بار بار اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ صابرین سے محبت کرتا ہے، اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے، اللہ متوکلین سے محبت کرتا ہے، اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

انسان ہی نہیں بلکہ ہر مخلوق کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھا ہے کہ جانور بھی اپنے بچوں سے محبت کرتا ہے، اپنی قوم سے محبت کرتا ہے، اسی طرح انسان کے اندر بھی فطری محبت رکھی ہے، ایک باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے، اولاد کو اپنے والدین سے محبت ہوتی ہے، آپس کی رشتہ داری سے محبت ہوتی ہے، تو یہ محبت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔

ایک انسان دوسرے انسان سے جو محبت کرے وہ اللہ کے لیے کرے، من احب للہ کی یہی روح

اور ایمانی محبت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ کہ کوئی مسلمان بندۂ کامل ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین سے اس کے بیٹوں سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اللہ کے رسول نے فرمایا: کہ اللہ کے لیے محبت کرو، صحابہ کی محبت اللہ کے لیے تھی، صحابہ کا پیار اللہ کے لیے تھا، صحابہ کا آپس میں تعلق اللہ کے لیے تھا، وہ اللہ کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے، اللہ کی رضا کے لیے، اللہ کی خوشنودی کے لیے، قرآن نے اللہ کے صحابہ کے بارے میں فرمایا :اشداء علی الکفار ورحماء بینھم دشمنوں پر بہت سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں، متحد ہیں، یقاتلون فی سبیل اللہ کانھم بنیان مرصوص وہ اللہ کے راستے میں قتال کرتے ہیں تو ایسے ہوتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار، چٹان بن جاتے ہیں، ان کو ایسا کسی چیز نے بنایا تھا؟ وہی اللہ کی لیے محبت۔ ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے فرمایا : سب سے بڑا پہلوان وہ ہے جو اپنے غصہ کو پچھاڑ دے۔

انسان کی فطرت میں غصہ بھی ہے، غصہ آنا انسان کی فطرت ہے، کسی کو غصہ بہت آتا ہے، کسی کو غصہ دیر میں آتا ہے، کسی کو جلدی غصہ آتا ہے، جلدی اتر جاتا ہے، کسی کو دیر میں آتا ہے، کئی کئی دن تک رہتا ہے، کوئی غصہ میں خاموش ہو جاتا ہے، کوئی اٹھا پٹک کرنے لگتا ہے، اور اپنی ذات کے لیے غصہ کرنا، یہی مطلبی غصہ ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی اپنی ذات کے لیے غصہ نہیں کیا، یہاں تک کہ بڑی بڑی نافرمانیاں اور کوتاہیاں خدمت گاروں سے ہو جاتی تھیں لیکن آپ درگزر کرتے تھے، معاف کر دیتے تھے۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں: میں دس سال کا بچہ تھا، اللہ کے رسول کی خدمت کرتا تھا، نادانی میں غلطیاں ہو جاتی تھیں، کبھی آپ نے ڈانٹا نہیں، تیز بولا نہیں، آپ کبھی اپنی ذات کے لیے ناراض نہیں ہوتے تھے لیکن جب دین کا معاملہ آتا تھا، دین میں کوئی بے حرمتی کرتا تھا، دین کے خلاف کوئی کام کرتا تھا، کان احمر وجہہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا تھا اور تورات کی تختیاں زور سے انھوں نے زمین پر رکھ دی تھیں، اس لیے کہ سامری نے بنو اسرائیل کو بت پرستی میں لگا دیا تھا، انبیاء کا غصہ ہوتا تھا دین کے لیے، علماء کا غصہ ہونا چاہئے دین کے لیے، لہٰذا البغض للہ فرمایا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: ابھی ایک شخص آئے گا وہ جنتی ہوگا، صحابہ انتظار

کرنے لگے، ایک صحابی آئے، صحابہ سمجھ گئے یہی جنتی ہیں، پھر دوسرے روز مجلس میں آپ تشریف فرما تھے، صحابہ آپ کے ارد گرد حلقہ بنائے ہوئے بیٹھے تھے، جیسے چاند کے ارد گرد ستارے، باادب بیٹھے ہوئے ہیں، اور آپ نے فرمایا :ابھی ایک شخص آئے گا وہ جنتی ہوگا، پھر وہی صحابی آئے اور بیٹھ گئے، تیسرے روز آپ نے پھر فرمایا: ابھی ایک شخص آئے گا وہ جنتی ہوگا، تیسرے روز بھی وہی صحابی آئے تو حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص جو ابھی نوجوان تھے، چھوٹے بچے تھے، کم عمر تھے، انہوں نے کہا مجھے شوق ہوا کہ حضرت کے بارے میں معلوم کروں آخر ان کے اندر کیا خوبی ہے کہ حضور. . .ان کو جنتی کہتے ہیں؟ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے ایک پلان بنایا کہ ان کے یہاں رات گزاریں گے، ان کے گھر گئے اور کہا حضرت گھر میں میرا کچھ معاملہ ہوگیا ہے، ایک دو روز میں آپ ہی کے یہاں رہوں گا، کہا کہ ٹھیک ہے، رہو۔ اب رات میں دیکھا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر آتے ہیں، سو جاتے ہیں، تہجد کے وقت بیدار ہوتے ہیں تہجد پڑھتے ہیں، پھر فجر پڑھتے ہیں اور کام پر چلے جاتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے تیسرے روز ان کو دیکھا تو بتایا کہ میں نے آپ کے یہاں قیام ایک مقصد کے لیے کیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز برابر ایک ہی بات کہی تھی کہ ابھی ایک شخص آئے گا اور وہ جنتی ہوگا، اور تینوں مرتبہ آپ ہی تشریف لائے، میں صرف دیکھنے آیا تھا کہ آپ کونسا خاص عمل کرتے ہیں؟ فرمایا : بھئی میں کوئی خاص عمل نہیں کرتا، ہاں کسی کے خلاف اپنے دل میں بغض نہیں رکھتا، ہر مسلمان سے محبت رکھتا ہوں، جب بستر پر جاتا ہوں تو میرا دل ہر ایک مسلمان کے بارے میں صاف ہوتا ہے۔

صحابہ کی یہ شان تھی، محبت بھی اللہ کے لیے اور بغض بھی اللہ کے لیے، وہ کافروں سے بغض اسی لیے رکھتے تھے کہ وہ کفر کی لعنت میں مبتلا تھے، شرک کی لعنت میں مبتلا تھے، لیکن جیسے ہی ایمان لاتے تھے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر دامنِ رسالت میں پناہ لیتے، کاشانۂ نبوت پر حاضری دیتے تھے، مجلسِ نبوی میں بیٹھ جاتے تھے، صحابہ کے دل ان کی طرف سے بالکل صاف ہوجایا کرتے تھے، کیوں کہ ذات کے لیے نفرت یا محبت نہیں تھی، اللہ کے لیے محبت تھی، ایمانی محبت تھی، اسلامی محبت تھی، دینی محبت تھی اور ہم کو جس سے بغض ہوجائے گا تو اس کی تمام نیکی کو برائی کے کھاتے میں ڈال دیں گے، یہ ہے البغض للہ کی حقیقت کہ صرف اللہ کے لیے ہو۔

کسی کو کچھ دینا بھی انسان کی فطرت ہے اور نہ دینا بھی انسان کی فطرت ہے، وہ کسی نہ کسی کو دیتا ہے، مدد کرتا ہے، اگر اللہ کے لیے دیتا ہے مطلب نکالنے کے لیے نہیں دیتا، شہرت کے لیے نہیں دیتا،

نام ونمود کے لیے نہیں دیتا، ناموری کے لیے نہیں دیتا، من اعطی للہ اللہ کے لیے اگر دیتا ہے تو اللہ کے یہاں اس کا درجہ بہت بلند ہوگا، اور اگر کسی کو نہیں دیتا ہے تو کیوں نہیں دیتا؟ اس لیے نہیں دیتا ہے کہ فلاں موقع پر اس نے تمہارا کام نہیں کیا تھا، تمہاری مدد نہیں کی تھی، نہیں دوں گا تم کو، روک دیتا ہے۔

حضرت مسطحؓ بن اثاثہ جن کی کفالت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کی اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مسئلے میں جب ان کے اوپر منافقین نے زنا کی تہمت لگائی تھی، حضرت مسطحؓ منافقین کے بہکاوے میں آ گئے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو صاحبزادی تھیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی، ام المؤمنین ہیں، اس لیے صدیق اکبرؓ کو حضرت مسطحؓ بن اثاثہ سے بہت تکلیف ہوئی، کہا: خدا کی قسم اب میں ان کی مدد نہیں کروں گا، فوراً آیت نازل ہوئی: **وَلاَ يَأْتَلِ أُوْلُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ وَاللهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ**۔ (النور ۲۳)

اور تم میں سے صاحبِ فضیلت اور صاحبِ توفیق اپنے قریبی لوگوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہ دینے کی قسم نہ کھائیں، پس چاہئے کہ معاف کردیں اور درگزر کریں، کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے اور اللہ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابو بکرؓ نے اللہ کی رضا کے لیے قسم توڑی، کفارہ ادا کیا اور پھر ان کی مدد کرنے لگے۔

ہمارا لینا دینا بھی اسلامی فطرت کے مطابق، محبت اور نفرت بھی ایمانی فطرت کے مطابق ہو جائے یہی اس حدیث کا اصل مقصد ہے، اگر ہم ہر عمل اللہ کے لیے کر لیتے ہیں تو پھر اس کا مقام ہی کچھ اور ہے، کیا مقام ہے؟ **فقد استکمل الایمان** یعنی اس کا ایمان کامل ہو گیا، اس نے اپنے ایمان کو مکمل کر لیا اور جس کا ایمان مکمل ہو گیا، اس کے لیے تو پوچھئے مت۔ ورضوان من اللہ اکبر اللہ کی رضا اسے مل جائے گی اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، جنت اس کی منتظر ہے، حوریں اس کی منتظر ہیں، فرشتے اس کے استقبال میں ہیں، قبر کی کشادگی اور قبر کا نور اس کا انتظار کر رہا ہے، زمین پر چلتا ہے، زمین فخر کرتی ہے، ناز کرتی ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ایک کامل الایمان جا رہا ہے، صاحبِ ایمان جا رہا ہے، یہ چار وصف جو ہماری فطرت ہے، اس میں صرف ڈھنگ بدل جائے، انداز بدل جائے تو ہماری زندگی سنور جائے۔

لائحۂ عمل

دینی مدارس اور ان کے انحطاط کے اسباب

تحریر: مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

جامع: وسیم فلاحی عفا اللہ عنہ

جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا، ہمارے انحطاط کا بنیادی سبب یہ ہے کہ رفتہ رفتہ دینی مدارس کے تعلیم وتعلّم کا یہ نظام ایک رسم بنتا جارہا ہے، اور اس کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہورہا ہے، اگرچہ ہماری زبانوں پر یہی جملہ رہتا ہے کہ ہماری تمام کاوشوں کا مقصدِ اصلی دین کی خدمت ہے، لیکن بسا اوقات یہ بات محض گفتار ہی کی حد تک محدود رہتی ہے، اور دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوتی، اگر یہ مقصد واقعۃً ہمارے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتا تو اس کی لگن سے ہمارا کوئی لمحہ خالی نہ ہوتا، پھر ہمیں اپنے اسلاف کی طرح ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ ہمارا کوئی عمل اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف تو نہیں، اور ہمارا طرزِ عمل خدمت دین اور اس کے مقصد کے لیے مفید ہورہا ہے یا مضر؟؟

اس کے برعکس عملاً ہماری تمام تر توجہات دینی مدارس کے ظواہر پر مرکوز رہتی ہیں، اور ان توجہات میں مقصدِ اصلی کی لگن کا کوئی عکس نظر نہیں آتا، عموماً منتظمین کے عملی مسائل یہ ہوتے ہیں کہ کس طرح مدرسے کی شہرت میں اضافہ ہو؟ کس طرح اس میں طلبہ کی تعداد بڑھے؟ کس طرح مشہور اساتذہ کو اپنے یہاں جمع کیا جائے؟ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کس طرح عوام میں مدرسے اور اس کے اہل حل وعقد کی مقبولیت میں اضافہ ہو؟ ہمارا طرزِ عمل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مدارس کے قیام سے ہمارے پیش نظر یہی بنیادی مقاصد ہیں، جن کے حصول کی دھن میں ہمارے شب وروز صرف ہورہے ہیں، چنانچہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بعض اوقات ایسے ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں، جو کسی دین اور اہل دین کے شایان شان نہیں ہوتے، بلکہ بعض اوقات تو ان مقاصد کے لیے واضح طور پر ناجائز ذرائع کے استعمال میں بھی باک محسوس نہیں کیا جاتا، اور اگر کسی مدرسے کو ان مقاصد میں فی الجملہ کامیابی حاصل ہوجائے تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ مقصد اصلی حاصل ہوگیا، لیکن طلباء کی تعلیمی، اخلاقی اور دینی حالت کیسی ہے؟ ہم کس قسم کے افراد تیار کرکے اس سے

معاشرے کی قیادت کے خواہش مند ہیں؟ اور فی الواقعہ ہماری جدوجہد سے دین کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ ان سوالات پر غور کرنے اور ان کی تڑپ رکھنے والے رفتہ رفتہ مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔

اس صورت حال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم ایک مرتبہ زبان سے اپنا مقصد اصلی خدمت دین کو قرار دینے کے بعد عملی زندگی میں اسے بھول جاتے ہیں، اور اپنی کوششوں کا تمام تر محور ان ظواہر کو بنا لیتے ہیں، جو یا تو شرعاً مطلوب ہی نہیں، یا اگر مطلوب ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ ان کو نیک نیتی سے مقصد کا محض ذریعہ قرار دیا جائے، خود مقصد نہ سمجھ لیا جائے۔

اسی طرح اساتذہ کا معاملہ عام طور سے یہ نظر آتا ہے کہ ان کا محور فکر بسا اوقات یہ رہتا ہے کہ ہمیں کونسا مضمون یا کونسی کتاب پڑھانے کے لیے ملے؟ طلبہ پر کس طرح اپنے علمی تفوق کی دھاک بٹھائی جائے، وہ کون سے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے طلبہ میں اپنی مقبولیت بڑھے؟ اور پھر اس مقبولیت میں اضافہ کی خاطر بسا اوقات یہ بات مد نظر نہیں رہتی کہ طلبہ کے لیے کونسا طرز عمل زیادہ مفید اور مناسب ہے؟ بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کیا طرز عمل طلبہ کی خواہشات کے مطابق ہے؟ چنانچہ اس کے نتیجے میں اساتذہ اپنے طلبہ کی رہنمائی کرنے کے بجائے ان کی خواہشات کے تابع ہو کر رہ جاتے ہیں، اور طلبہ اساتذہ کے پیچھے نہیں چلتے، بلکہ اساتذہ طلبہ کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔

ماضی میں خاص طور پر دینی مدارس کی روایت یہ رہی ہے کہ اساتذہ اور طالب علم کا رشتہ محض ایک رسمی رشتہ نہیں ہوتا تھا، جو درسگاہ کی حد تک محدود ہو، اس کے بجائے وہ ایک ایسا روحانی رشتہ ہوتا تھا، جو دائمی طور پر عمر بھر قائم رہتا تھا، استاذ صرف کتاب پڑھانے کی ڈیوٹی ادا کرنے والا معلم نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اپنے طلبہ کے لیے ایک مشفق باپ، ان کا اخلاقی اور روحانی مربی اور علم وعمل دونوں میدان میں ایک شفیق نگراں کی حیثیت رکھتا تھا، جو طلبہ کے نجی معاملات تک دخیل ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ اپنے اساتذہ سے علمی استعداد کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی حاصل کرتے تھے، ان سے زندگی کا سلیقہ سیکھتے تھے، ان سے للّٰہیت، ایثار، تواضع اور دوسرے اخلاق فاضلہ اپنی زندگی میں جذب کرتے تھے، اور اس طرح شاگرد اپنے استاذ کے علم وعمل کا آئینہ ہوا کرتا تھا۔

اب رفتہ رفتہ یہ باتیں داستان پارینہ ہوتی جا رہی ہیں، اور وجہ وہی ہے کہ استاذ نے اپنا مقصد صرف درسگاہ میں ایک ایسی تقریر کرنے کو بنا لیا ہے، جسے طلبہ پسند کر سکیں، رہی یہ بات کہ کس قسم کی تقریر ان

طلبہ کے لیے زیادہ مفید ہے؟ ان طلبہ کو مفید تر بنانے کے لیے ان کو کن کاموں کا مکلّف کرنا ضروری ہے؟ طلبہ کے کون سے رجحانات ان کے علم وعمل کے لیے مضر ہیں؟ ان رجحانات کو کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے؟ طالب علم درسگاہ سے باہر جا کر کس قسم کی زندگی گزارتے ہیں؟ ان سوالات کے بارے میں سوچنے اور ان مقاصد کی لگن رکھنے والے مفقود ہوتے جارہے ہیں۔ الاماشاءاللہ

دارالعلوم دیوبند کی بنیادی خصوصیت، جس کی بناء پر وہ برصغیر کی دوسری درسگاہوں سے ممتاز ہوا، یہ تھی کہ وہ علم برائے علم کا ادارہ نہ تھا، بلکہ انسانوں کی ایسی تربیت گاہ تھی، جس سے صحیح العقیدہ سچے اور پکے مسلمان تیار ہوتے تھے، اپنی گفتار سے زیادہ کردار سے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔

اس وقت ہمیں سب سے پہلے اپنے ماحول میں دینی مدارس کی اسی روح کو ازسرنو تازہ کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کے بغیر ہماری درسگاہیں اگر بہت کامیاب ہوئیں تب بھی محض علم برائے علم کے مراکز بن کر رہ جائیں گی، مدرسے قائم کرنا اور ان میں چند لگے بندھے علوم کا درس دینا بذات خود ایک مقصد بن جائے گا، جس میں بہت سے مستشرقین یورپ بھی سرگرم عمل ہیں، اور رفتہ رفتہ ہم سے سارے اوصاف گم ہوجائیں گے، جو ان علوم کی درس وتدریس کے لیے لازمی شرط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دینی مدارس میں یہ اصل روح جو مرور ایام سے دھیمی پڑتی جارہی ہے، ازسرنو تازہ کرنے کے لیے سب سے اہم ذمہ داری ان درسگاہوں کے اساتذہ اور منتظمین پر عائد ہوتی ہے، ان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ پہلے اپنے ذاتی اعمال واخلاق کا جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ اسلامی علوم نے ان میں اپنا کوئی رنگ پیدا کیا ہے یا نہیں؟ خوف خدا اور فکر آخرت میں کتنا اضافہ ہوا؟ اللہ کے ساتھ تعلق کتنا بڑھا؟ عبادت کے ذوق میں کتنی زیادتی ہوئی؟ جن فضائل اعمال کی دوسروں کو شب وروز تلقین کی جاتی ہے، ان پر خود کتنا عمل پیرا ہوئے؟ جس انفاق فی سبیل اللہ کی دوسروں کو بڑھ چڑھ کر تاکید کی جاتی ہے، اس میں ہم خود کس قدر حصہ دار بنے؟ دین کے خاطر جان ومال کی قربانی دینے کے جذبے نے کتنی ترقی کی؟ معاشرے کے بگاڑ سے کرب واضطراب کی کیفیت اور اس کی اصلاح کی فکر کس حد تک دل ودماغ پر طاری ہوئی؟

یہ ساری باتیں ہمارے سوچنے کی ہیں، اور اگر ہم حقیقت پسندی کے ساتھ ان سوالات کا جواب اپنے عمل میں تلاش کریں۔

اسلامی تعلیمات

امت مسلمہ کی خصوصیت

اعتدال اور میانہ روی

مولانا عبدالمتین

مدیر مدرسہ دارارقم لیاری کراچی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے پہلے ماضی میں بہت سی امتیں رہی ہیں لیکن اللہ ربّ العزت نے کسی امت اور کسی قوم کو یہ اعزاز نہیں بخشا جو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشا ہے۔اس بات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ روزِ محشر جب تمام لوگ جمع ہوں گے تو کل ایک سو بیس صفیں قائم ہوں گی جن میں سے اسّی (۸۰) صفیں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوں گی اور بقیہ چالیس صفیں دیگر امتوں کی ہوں گی۔

پچھلی جتنی امتیں گزری ہیں ان میں یہ خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ بات کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے یا بہت ہی زیادہ معمولی بنا دیتے ، امت محمدیہ کی یہ خصوصیت بتائی کہ یہ باتوں کے اعتدال کو جانتی ہے اور دین وشریعت کے مزاج کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا اس امت کو آتا ہے اسی وجہ سے اس امت کو آخری اور سب سے زیادہ فضیلت والی امت قرار دیا گیا ہے۔

صحابہ کا مزاج اعتدال سے بھر پور نظر آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر ہر صحابی اپنی جان و مال قربان کرنے کو تیار ہے لیکن کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ خدا کا درجہ دوں گا بلکہ کہتا یہی ہے کہ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يَقُولُ جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى بيوت أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا أخبروا كَأَنَّهُمْ تقالوها فقَالُوا وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ قَالَ أحدهم أما أنا فَإِنِّي أُصَلِّي اللَّيْلَ أبدا وَقَالَ آخر أَنَا أَصوم الدَّهْرَ وَلَا أفطر وَقَالَ آخر أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا

فَجَاءَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ: أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا أَمَا وَاللهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي (مشکوٰۃ ۱۴۵)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں، تین اشخاص نبی ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھنے کے لیے نبی ﷺ کی ازواج مطہرات کے پاس آئے، جب انہیں اس کے متعلق بتایا گیا، تو گویا انہوں نے اسے کم محسوس کیا، چنانچہ انہوں نے کہا: ہماری نبی ﷺ سے کیا نسبت؟ اللہ نے تو ان کی اگلی پچھلی تمام خطائیں معاف فرما دی ہیں، ان میں سے ایک نے کہا: میں تو ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا: میں دن کے وقت ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا اور تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے اجتناب کروں گا اور میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ نبی ﷺ ان کے پاس آئے اور پوچھا: تم وہ لوگ ہو جنہوں نے اس طرح، اس طرح کہا ہے، اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات کو نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔

بہت ہی خوب صورت اور تسلی بخش انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے توسط سے امت کو اعتدال کا پیغام دیا اور اپنی مثال دے کر بیان فرمایا تا کہ اس پر عمل کرنا، مشاہدہ کرنا، سیکھنا آسان ہوجائے اور ایک حتمی نکتہ یوں بیان فرمایا کہ یہی میرا طریقہ ہے یہی شریعت ہے اور اسی معتدل انداز میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے باقی جو یہود و نصاریٰ کی طرح افراط تفریط کا شکار ہوگا اس کا امت مسلمہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس امت کی پہچان ہی اعتدال ہے۔

عقائد میں اعتدال کی تعلیم

ایک مسلمان کچھ اہم باتوں پر ایمان لے آتا ہے لیکن اسے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ عقائد میں تمام عقائد ایک برابر نہیں بلکہ ان میں ایک ترتیب قائم ہے مثلاً توحید کو عقائد میں سب سے پہلا درجہ حاصل ہے اور رسالت کو دوسرا۔

اب اگر کوئی عقیدہ رسالت پر اتنا زور دے کہ اسے توحید سے بھی زیادہ اہم ثابت کرے تو یہ اعتدال کی پٹڑی سے ہٹ جانے والی بات ہے۔

اسی طرح عقائد میں اعتدال نہ ہونے کی ایک بڑی شکل یہ ہے کہ عقیدہ توحید کو اس درجہ شدت سے بیان کیا جائے کہ امت کے ہر دوسرے فرد کو مشرک سمجھنے لگے۔توحید پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہرگز درست نہیں کہ اولیاء اللہ کی گستاخی کی جائے، ان کی کرامات کا انکار کیا جائے اور توحید کو سمجھانے کے بہانے اہل اللہ پر معاذ اللہ مزاحیہ جملے کسے جائیں۔

بے شک توحید دین کا مرکزی ستون ہے اور شرک سب سے گناہ عظیم بلکہ ظلم عظیم ہے لیکن اس کی آڑ میں اسی توحید کے داعی صوفیاء اور اولیاء کی کردار کشی کرتے ہوئے سستے بازاری جملوں کا استعمال ان بزرگوں کے بالکل بھی شایان شان نہیں۔یہ سب کے سب توحید کے حوالے سے اعتدال سے ہٹ جانے والے رویے ہیں۔

اسی طرح انبیاء علیھم السلام اور بزرگان دین کے ساتھ عقیدت ومحبت کا تعلق پیدا ہوجانا ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر دین کے بہت سے پہلو ادھورے رہ جاتے ہیں لیکن اپنے سوا ہر ایک کو گستاخ قرار دینا اور محبت وعقیدت کو اپنا ٹھیکہ سمجھ لینا غلط بات ہے۔اسی طرح عقیدت کی آڑ میں اولیاء کو صحابہ سے بلند مرتبہ دینا یا انبیاء کو خدا کا مرتبہ دینا اور پھر عقیدت کی اوڑھنی اوڑھ کر شرک، بدعت کے دھندوں میں لگ جانا، عقیدت کے سہارے خود کو توحید نماز روزہ حج جیسی عبادات سے بری سمجھنا، یہ جہالت کی انتہاء ہے جو کہ امت مسلمہ کی اعتدال والی خصوصیت کے یکسر خلاف ہے۔

اس میں اعتدال کا طریقہ یہ ہے کہ توحید پر ایمان رکھے لیکن بزرگان دین کے مقام کو بھی سمجھے، رسالت پر ایمان رکھے لیکن عقیدت ومحبت کا درست استعمال بھی سیکھے۔

مال خرچ کرنے کے متعلق اعتدال

اسی طرح جب مال خرچ کرنے کی باری آتی ہے تو کوئی اپنے مال کو بے تحاشہ خرچ کرتا ہے تو شریعت منع کرتی ہے کہ تم فضول خرچی اور اسراف سے بچو اور اگر کوئی اپنے مال کو خرچ ہی نہیں کرتا تو شریعت یہ کہتی ہے کہ تم کنجوسی سے بھی بچو جیسے اللہ ربّ العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

وَالَّذِینَ اذا اَنفَقُوا لَم یُسرِفُوا وَلَم یَقتُرُوا وَکَانَ بَینَ ذٰلِکَ قَوَامًا

اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے۔(الفرقان ٦٧)

یعنی اللہ کریم ہمیں یہ بتلا رہے ہیں کہ رحمان کے بندے وہ ہیں جو اعتدال اور میانہ روی پر قائم ہیں اور

خرچ کرنے میں اعتدال پر قائم ودائم ہیں، افراط اور تفریط سے بچے ہوئے ہیں، کیونکہ جب فضول خرچی کرے گا تو پھر گناہ اور عیاشی میں مبتلا ہوجائے گا اور بہت سی غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ کر خریدنے کا بوجھ اٹھائے گا اور اگر کنجوسی کرے گا تو زکوۃ، قربانی، حج، صدقہ خیرات، صلہ رحمی، اہل وعیال کے حقوق وغیرہ کیسے ادا کرے گا؟ اسی لیے شریعت نے اعتدال کی راہ دکھلائی کہ تمہیں انفاق بھی کرنا ہے اور اسراف سے بھی بچنا ہے۔

شادی بیاہ کے موقع پر اعتدال

ہماری شادی بیاہ کی جو رسومات ہیں عام طور پر ان کے متعلق علماء یہ فرماتے ہیں کے شادی شریعت کے مطابق کرو، تو ہمارے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شریعت کے مطابق شادی شاید سوگ منانے جیسا عمل ہے، اگر شادی شریعت کے مطابق ہوگی تو سوگ والا ماحول ہوگا، تسبیح پڑھنی ہوگی، قرآن خوانی یا آیت کریمہ کا ختم کرنا ہوگا اور پھر ایسا لگے گا کہ خوشی کا ماحول ہی نہیں ہے، جبکہ ایسا بالکل نہیں ہے، شادی ایک خوشی کا موقع ہے اور اسے خوشی خوشی ہی منانا چاہیے اور خوشی منانے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس سے منع نہیں کیا جارہا، لیکن چند شرائط بتائی جارہی ہیں، جن کا لحاظ ضروری ہے، مثلاً بے پردگی نہ ہو، ڈھول باجے نہ ہوں، ہندوانہ رسم ورواج نہ ہوں، باقی ان شرائط کے ساتھ جیسے چاہو اپنی خوشی منالو، یہاں تک کہ آپ علیہ السلام خود اس کی ترغیب دے رہے ہیں کہ نکاح کی تقریب کا بھرے مجمع میں اہتمام کرو، مسجد میں نکاح کرو، ولیمہ کرکے سب کو اپنی خوشی میں شریک کرو وغیرہ وغیرہ۔

آپس کے تعلقات میں اعتدال

اکثر ہمارے آپس کے تعلقات میں بھی افراط وتفریط کی جھلک دکھائی دیتی ہے، کسی سے اگر تعلق بنانا ہے تو ایسا تعلق قائم کریں گے کہ اس پر جان بھی نثار کریں گے، ہر وقت اسی کے ساتھ بیٹھک لگائیں گے، گپ شپ لگی رہے گی، وقت بے وقت یار کو ڈھونڈتے رہیں گے، کہیں آنا جانا، تقریبات میں شرکت کرنا، یہاں تک کہ لین دین بھی اسی کے ساتھ کرنے کا سوچیں گے، لیکن ایک اختلاف سے یہ گہری دوستی دشمنی میں بدل جاتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں ہوتا۔

یہ ہمارے تعلقات میں پائی جانے والی بڑی عام بے اعتدالی ہے جو ہم کرتے رہتے ہیں۔

اب شریعت یہ نہیں کہتی کہ ہم ہر ایک سے دوستیاں کرتے پھریں اور ہر ایک کو اپنے سر کا تاج بنالیں اور ہر ایک سے لین دین شروع کردیں، بلکہ عام مسلمانوں کے حوالے سے جو روش اپنانی چاہیے اس

کے متعلق فرمایا کہ ایک مسلمان کی مال، جان، عزت وآبرو کی تم حفاظت کرو، اس کے ساتھ سلام علیک رکھو، ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرو، بس اتنا ہی کافی ہے۔

باقی کسی سے ایسی دوستی کرنا کہ اس کے غلط کو بھی صحیح قرار دینا اور کسی سے ایسی نفرت کرنا کہ اس کی ساری اچھائیاں نظر انداز کرنا، دونوں رویے غلط ہیں۔ اگر ہم کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو اس میں خوبی بھی ہو سکتی ہے اور خامی بھی، تو ہم اس کی خوبی پر نظر رکھیں اور اس کی خامی کو نظر انداز کریں۔

لہٰذا ہمارے ہر عمل میں اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہے، عقیدے میں بھی، عبادت میں بھی، حقوق کی ادائیگی میں بھی، خرچ میں بھی، سیاست میں بھی، نیکیوں میں بھی، آپس کے تعلقات میں بھی اور ہمارے مزاج اور اہم فیصلوں میں بھی اعتدال ہونا چاہیے تاکہ ہم امت مسلمہ کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

وفیات نمبر کے بارے میں

زیر نظر اشاعت ''وفیات نمبر'' میں ۲۰۲۰ء سے لے کر اس کے بعد تک کے وفات پانے والے ایسے اصحابِ علم وفضل کا تذکرہ، ان کی علمی و دینی خدمات پیش کی گئی ہیں جو برصغیر میں اپنی علمی وعرفانی اور روحانی وملی خدمات کے حوالہ سے عوام وخواص کا مرجع رہے ہیں، اور مظاہر علوم سہارنپور اور یہاں کے حضرات اکابر سے انتساب واکتسابِ فیض اور ذہنی وقلبی وابستگی خود ان کے لئے بھی باعثِ افتخار واعزاز رہی ہے۔

لاک ڈاؤن کے زمانہ میں حالات کی وجہ سے ماہنامہ مظاہر علوم کی جو اشاعتیں موقوف رہ گئی تھیں دراصل یہ خاص اشاعت اس کے بدل کے طور پر ہے۔

اس لئے ماہنامہ مظاہر علوم کے اُن ممبران سے درخواست ہے جو ۲۰۲۰ء میں باقاعدہ اس کے خریدار تھے کہ وہ مبلغ تیس روپئے کا محصول ڈاک بھیج کر اپنا رسالہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک منگالیں، سادہ ڈاک سے ارسال کرنے میں اس اہم اشاعت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

کسی بھی طرح کی معلومات کے لئے بذریعہ واٹس ایپ رابطہ کریں۔

مولانا عبداللہ خالد قاسمی خیر آبادی 7895886868

مولانا ذاکر حسین مظاہری 9411899044

زاویۂ فکر

دینی مدارس

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ — دہلی

یہ ایک حقیقت ہے کہ گزشتہ دو تین سال کے عرصہ میں پورے برصغیر میں ناموافق حالات کے باوجود اسلامی افکار و اقدار کی حفاظت جس ذریعہ سے انجام پائی ہے، وہ مدارس اسلامیہ ہے، ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارے ملک میں دینی تعلیم کے ادارے موجود تھے؛ لیکن یا تو وہ حکومتوں کے تحت چلتے تھے، یا بڑے نوابوں اور رؤساء اپنی ڈیوڑھیوں میں مدارس قائم کیا کرتے تھے، قوم وملت کا براہ راست ان اداروں سے تعلق نہیں تھا ؛اس لئے یہاں طلبہ محدود بھی ہوتے تھے، اور پڑھنے پڑھانے والے دوسری طرح کے تعلیمی اداروں کی طرح ایک پیشے کی طور پر کیا کرتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے صرف ایک مدرسہ قائم نہیں کیا؛ بلکہ قیام مدارس کو ایک تحریک کی شکل دی اور اس کے لئے یہ نظام قائم فرمایا کہ ان اداروں کو عوامی تعاون کے ذریعہ چلایا جائے، حکومت اور اصحابِ ثروت کا محتاج نہ رکھا جائے، اس کے متعدد فائدے ہوئے۔

اول یہ کہ یہ ادارے حکومتوں اور سرمایہ داروں کی بے جا مداخلت سے محفوظ ہو گئے۔

دوسرے: یہاں طلبہ صرف تعلیم ہی حاصل نہیں کرتے؛ بلکہ ان میں دینی غیرت وحمیت بھی پیدا کی جاتی ہے؛ تاکہ وہ اپنے آپ کو اسلام کا ایک ہمہ وقتی پاسبان تصور کریں۔

تیسرے: چوں کہ یہ ادارے عوامی مدد سے چلتے ہیں؛ اس لئے عوامی جواب دہی کا احساس بھی ان کے اندر رہتا ہے، اور یہ چیز بہت سے مواقع پر ان کو انحراف اور غلط روش سے محفوظ رکھتی ہے۔

چوتھے: عوام کا ان اداروں سے تعلق قائم رہتا ہے، اور اس کی وجہ سے عام مسلمان اپنے علماء سے مربوط رہتے ہیں۔

پانچویں: اس تعلق کے نتیجہ میں علماء کے اندر بھی عام مسلمانوں کی فکر باقی رہتی ہے، آج جو مدارس اور مکاتب کی فکر کررہے ہیں، اصلاحِ معاشرہ کی تحریک چلارہے ہیں، دارالقضاء کا نظام قائم کررہے ہیں، دیہاتوں میں مسجدیں تعمیر کرارہے ہیں، حسبِ موقع خدمت خلق کے کام بھی کرتے ہیں، یہ سب اسی فکرمندی کا نتیجہ ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ عطیات کی رقم سے لوگ دینی مدارس کا تعاون کرتے؛ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے؛ بلکہ افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے مسلمان تو زکوٰۃ کی رقم بھی ادا نہیں کرتے ہیں، مدارس کے ذمہ داران، اساتذہ اور سفراء کی بڑی تعداد شہروں میں مدارس کے لئے فراہم مالیہ کا کام کرتی ہے، اس کام میں انسان نفس شکنی کے مرحلہ سے گزرتا ہے، معاونین کی طرف سے بعض دفعہ بہت ہی ناروا جملے کہے جاتے ہیں، عزت نفس پر چوٹ پڑتی ہے؛ اس لئے اگر کوئی آدمی اخلاص اور اللہ کی رضا کے جذبہ سے اس کام کو کرے، تو یقیناً وہ بڑے اجر کا مستحق ہے؛ لیکن اگر ذاتی نفع کے جذبے سے کیا جائے تو یہ گھاٹے کا سودا ہے؛ کیوں کہ ایک حقیر سی اُجرت ملتی ہے، عزت پامال ہوتی ہے، اور آخرت کی محرومی کا نقصان سب سے سوا ہے، عمل کتنا بھی اچھا ہو اور کتنی ہی مشقت کے ساتھ انجام دیا جائے، اگر اخلاصِ نیت اس عمل کا رفیق نہ ہو تو بے قیمت راکھ کا ڈھیر ہے۔

مدارس کے معاملے میں آج کل افراط وتفریط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے، ایک طرف وہ لوگ ہیں، جو مدارس کو نشانہ بناتے ہیں؛ بلکہ لوگوں کا ذہن بناتے ہیں کہ مدارس کو تعاون نہ دیا جائے، یہ دانستہ یا نادانستہ ایک اہم ترین اسلامی کاز کو نقصان پہنچارہے ہیں، دوسری طرف وہ اہل مدارس ہیں جو اپنے سلف صالحین کے روش سے ہٹ چکے ہیں، اور انھوں نے مدارس کو بعض عوام کی زبان میں تجارت بنالیا ہے، جہاں اصحابِ خیر کو مدارس کی اہمیت اور افادیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے، وہیں مدارس کو بھی خود اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے، اگر ارباب مدارس نے اس طرف توجہ نہیں دی تو جو حال وسط ایشیا کے ملکوں میں کمیونسٹ تحریک کے غلبہ سے پہلے علماء ومشائخ اور تعلیم گاہوں اور خانقاہوں کا ہوا، وہ منظر اور وہ تاریخ خدانہ خواستہ یہاں بھی ہوسکتی ہے۔

اس لئے اس سلسلے میں چند بنیادی باتیں عرض کی جاتی ہیں:

۱- اس وقت جو نئے مدارس قائم کئے جارہے ہیں، شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان میں ۷۵ رفیصد بلاضرورت ہیں، اور کسی خاص مقصد کے تحت قائم نہیں کئے جارہے ہیں، شہر کے ایک ہی محلہ میں کئی کئی مدارس، ایک ہی گلی میں کئی کئی ادارے؛ حالاں کہ صورت حال یہ ہے کہ محلہ کے ایک مدرسہ میں اگر تمام مدارس کے طلبہ کو جمع کردیا جائے، تب جا کر

وہ ایک چھوٹا موٹا مدرسہ کہلانے کا مستحق ہوگا، مدارس کی یہ بے وجہ کثرت زیادہ سے زیادہ اساتذہ، منتظمین اور عملہ کی تنخواہوں کا بوجھ اُمت کے کاندھوں پر ڈالتا ہے، بعض جگہ تو جتنے بھائی ہیں، ہر بھائی کا الگ الگ مدرسہ ہے، اور اب لڑکیوں کی تعلیم گاہوں میں بھی یہی نوبت آرہی ہے کہ ہر بہن اور ہر بھاوج کے الگ الگ مدرسے ہیں۔

۲— یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ مدرسہ میں زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے، چند بچوں کی آمد و رفت ہے؛ لیکن زکوٰۃ کا جواز پیدا کرنے کے لئے کہیں دُور دراز سے آٹھ دس بچے لے آئے، دارالاقامہ قائم کرلیا کہ اب کوئی اعتراض نہ ہو اور ان بچوں کا سہارا لے کر زکوٰۃ وصول کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے؛ حالاں کہ جس مرحلے کی تعلیم کے لئے دُور دراز کے بچوں کو لایا جارہا ہے، وہاں اس مرحلے کی تعلیم کے بہت سارے ادارے موجود ہیں، داخلہ کی گنجائش بھی ہے اور مدرسہ کو طلبہ کی ضرورت بھی؛ لیکن سرپرستوں کو بہلا پھسلا کر بچے لائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ لانے والے حضرات ایک طرف مدرسہ کے مہتمم سے پیسے وصول کرتے ہیں، اور دوسری طرف بچوں کے غریب سرپرستوں سے، اب چائلڈ لیبر قانون اتنا سخت ہوگیا ہے کہ بعض دفعہ بچے پکڑے بھی جاتے ہیں، اور رشوت دے کر انھیں چھڑایا جاتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ نے اس انداز پر مدارس قائم کرنے کا حکم دیا ہے، اور یہ ثواب کا عمل ہے یا عنداللہ جواب دہی میں اضافہ کا سبب؟

۳— خلافِ واقعہ بات کہنے کو جھوٹ کہتے ہیں، اور دوسروں کو خلاف واقعہ باتوں کا یقین دلایا جائے، یہ دھوکہ ہے، جب غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے دوسرے کو کوئی خاص بات باور کرائی جائے تو اس میں جھوٹ اور دھوکہ دونوں کی شمولیت ہوجاتی ہے، کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مدارس کے تعارف میں شاید جھوٹ کو بُرا نہیں سمجھا جاتا؛ اس لئے طلبہ اور فارغین کی تعداد میں بڑے ہی مبالغے سے کام لیا جاتا ہے، بعض حضرات نے مدرسوں کا براہ راست جائزہ لیا تو ذمہ داروں نے قرب و جوار کے دوسرے مدارس کے طلبہ کو بھی اپنے یہاں جمع کرلیا؛ تاکہ زیادہ تعداد کا یقین دلایا جاسکے، اور اپنی غلط بیانی پر پردہ ڈالا جاسکے، اگر کسی شخص نے جھوٹ پر مبنی تعارف ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا اور اسے ایک ہزار لوگوں تک پہنچایا تو گویا اس نے ایک ہزار بار جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے کا ارتکاب کیا ہے، اگر مدارس کے ذمہ داران کا یہ کردار ہو تو بے دین نظر آنے والے لوگوں کا کیا شکوہ کیا جائے، جھوٹ کی انتہا تو یہ ہے کہ بعض دفعہ کمپیوٹر کے ذریعہ جعلی تصدیق نامہ تیار کرنے کی بھی خبر ملتی ہے، سفراء پکڑے جاتے ہیں، اور کبھی پولیس اور کبھی عوام کے ذریعہ ان کی سرزنش بھی ہوتی ہے۔

۴- یہ جھوٹ اور دھوکہ ان مدارس میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، جو سرکاری امداد حاصل کرتے ہیں، جتنی برائیاں سرکاری ملازمت کے دوسروں شعبوں میں پائی جاتی ہیں، قریب قریب وہ سب اضافہ کے ساتھ ان مدرسوں میں پائی جاتی ہیں، طلبہ کا داخلہ نہیں ہوتا؛ لیکن رجسٹر داخلہ میں ناموں کا اندراج کیا جاتا ہے، طلبہ صرف امتحان دیتے ہیں؛ لیکن ایک حاضر باش طالب علم کی حیثیت سے اس کا فارم پُر کرایا جاتا ہے، اساتذہ امتحان کے سنٹر پہنچ کر بچوں کو چوری کراتے ہیں، پھر جب کاپیاں ممتحن کے پاس جاتی ہیں تو غلط طور پر اس کے نمبرات بڑھواتے ہیں، مدرسہ میں حاضر نہیں ہوتے؛ لیکن رجسٹر حاضری پر دستخط کرتے اور تنخواہ اُٹھاتے ہیں، غرض جھوٹ اور دھوکہ کا ایک سلسلہ ہے، جو شروع سے آخر تک اس نظام کو اپنے گھیرے میں لئے ہوا ہے۔

۵- ایک عجیب تصور مدارس کی ملکیت کا قائم ہو گیا ہے، مدرسہ کو ملکیت سمجھا جاتا ہے، مدرسہ کی املاک مدرسہ کے نام پر خریدنے کے بجائے لوگ اپنے نام پر خرید کرتے ہیں، یہ نہایت افسوس ناک بات ہے؛ اس لئے بعض دفعہ والد کی وفات کے بعد بیٹا لازمی طور پر اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا ہے، چاہے وہ عالم تک نہ ہو، پھر یہیں سے مدرسہ پر قبضہ کے لئے بھائیوں کے درمیان اور کبھی متوفی کے بیٹوں اور داماد کے درمیان جھگڑا شروع ہوتا ہے، اگر کسی شخص کا بیٹا واقعی اپنے علم وفضل کے اعتبار سے اس ادارہ کو چلانے کا اہل ہو، مجلس انتظامی اسے ادارہ کا ذمہ دار بنا دے، اور وہ ایک مالک کی حیثیت سے نہیں منتظم کی حیثیت سے اس کا نظم چلائے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ بلکہ بعض دفعہ انتشار سے بچنے کے لئے یہ صورت بہتر بھی ہوتی ہے، اور اسی لئے بعض بڑے مدارس میں اس کی روایت رہی ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منتظم ادارے کا مالک ہو گیا۔

مدارس کی اہمیت سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ دین کے قلعے اور اسلام کی حفاظت گاہیں ہیں، لیکن مدارس کے وقار کی حفاظت بھی خود اربابِ مدارس کی ذمہ داری ہے، اصحابِ خیر کو ان اداروں کا بھرپور تعاون کرنا چاہئے، بہت بڑی تعداد مفید اور کارکرد مدارس کی بھی ہے، تجار اور اصحابِ ثروت جیسے اپنے کاروبار میں تحقیق وتفتیش کرتے ہیں، اسی طرح مدارس کے بارے میں بھی تحقیق سے کام لیں، اور کھرے کھوٹے میں فرق کریں، نہ یہ درست ہے کہ مدارس کے تعاون سے ہاتھ روک لئے جائیں، اور نہ یہ مناسب ہے کہ بلا تحقیق ہر ادارے کا اس طرح تعاون کیا جائے، جیسا بہت سے لوگ ہر گداگر کے کشکول میں روپے دو روپے ڈالتے جاتے ہیں۔ وما أرید إلا الإصلاح، و اللہ هو الموفق

علمی تحقیق دوسری و آخری قسط

مسجدِ نبوی (علی صاحبہ الصلاۃ والسلام) میں نماز کا ثواب

مولانا محمد معاویہ سعدی

استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

۲- **دوسرا سؤال** کہ ''بابِ فضائل میں اگر حدیثِ ضعیف، حدیثِ صحیح کے معارض ہوجائے تو کیا اس کو تعارض مان کر حدیثِ صحیح کو ترجیح دی جائے گی، یا دونوں حدیثوں پر عمل کیا جائے گا؟'' اِس کا عمومی جواب تو یہ ہے کہ:

اَ: پہلے تو یہ دیکھا جائے گا کہ جو ''ضعیف'' ہے، اُس کا ضعف سنداً قابلِ تحمل ہے، یا نہیں؟

ب: اگر سنداً قابلِ تحمل نہ ہوا پھر تو ردّ ہی کر دیا جائے گا، اور اگر لائقِ تحمل ہوا تو معارضہ پر نظر کی جائے گی، کہ معارضہ تامہ ہے، یا تطبیق کی کوئی شکل ہوسکتی ہے؟

ج: اگر تطبیق کی شکل ممکن ہو، اور کوئی اور عارض نہ ہو تو تطبیق دی جائے گی، ورنہ ''ضعیف'' کو اُس کے ضعف کے پیشِ نظر ردّ کر دیا جائے گا۔

شیخ عوامہ دامت برکاتہم حدیثِ ضعیف کے قبول کی شرائط بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

... أن لا یخالف ھذا الضعیفَ حدیثٌ صحیحٌ. قال: و أزید تقییداً آخر لھذا الشرط، ھو أن لا تکون المخالفة مخالفة تامة، بحیث لا یمکن الجمع بینھما، أما إذا أمکن الجمع فلا تعتبر مخالفةً تامةً۔ (حکم العمل بالحدیث الضعیف۔ص ۱۱۰)

یعنی: حدیثِ ضعیف پر عمل کی منجملہ شرائط کے ایک یہ ہے کہ کسی حدیثِ صحیح سے معارض نہ ہو۔ شیخ فرماتے ہیں: اِس میں یہ شرط بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ معارضہ واقعی معارضہ ہو، لہٰذا جب تک جمع ممکن ہوگا (وہ) معارضۂ تامہ متحقق نہ ہوگا (جو موجبِ ردّ ہوتا ہے)۔

اِس اُصول کی روشنی میں یہاں زیرِ بحث مسئلہ میں بھی علماء نے دونوں ہی طریقے اختیار فرمائے ہیں: ترجیحِ صحیح کا بھی، اور جمع و تطبیق کا بھی۔

۱- ترجیحِ صحیح کی صورت: ابو زرعہ عراقیؒ اپنے والد حافظ ابو الفضل عراقیؒ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **وأما الاختلاف في مسجد المدينة، فأكثر الأحاديث الصحيحة "أن الصلاة فيه خير من ألف صلاة"...، وقال: وأصح طرق أحاديث التضعيف في المدينة: "إنها أفضل من ألف" (طرح التثريب ٦/٥١)۔**

یعنی: جہاں تک مسجدِ مدینہ سے متعلق اختلافِ روایات کی بات ہے تو اکثر احادیثِ صحیحہ میں "ایک ہزار گنا" ہی کا ذکر ہے۔

ملا علی قاری، علامہ ابن حجرؒ سے "پچاس ہزار گُنے" والی روایت کے بارے میں نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **قيل: إنه حديث منكر، لأنه مخالف لما رواه الثقات** (مرقاۃ المفاتیح، رقم الحدیث: ۷۵۲)

"خمسين ألف صلاة" والی روایت منکر ہے، اِس لیے کہ وہ ثقات کی روایات کے خلاف ہے۔

۲- : جمع وتطبیق کی صورت: علامہ ابن حجر ہیتمیؒ اور ملا علی قاریؒ نے دو طرح سے جمع فرمایا ہے:

۱- پہلے فضیلت کم رہی ہو، پھر بفضلہٖ تعالیٰ (حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور طلب کی برکت سے) اُس میں اضافہ کر دیا گیا ہو، جیسا کہ اور بھی بہت سے اُمور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں سے اُمت کو اِس طرح کے مفاخر حاصل ہوئے۔ (مرقاۃ المفاتیح، رقم ۷۵۲)۔

۲- اِس کو اَفراد واَحوال کے اِختلاف پر محمول کر لیا جائے، کہ "صفتِ اِحسان" کے کمال وعدمِ کمال سے فضیلت میں اضافہ، یا کمی ہو سکتی ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح، رقم ۶۹۲)۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۳) تیسرا سوال کہ "لا مفہوم للعدد" جو اُصول ہے، اس کا مطلب اور محمل کیا ہے؟"۔

اِس کا بھی عمومی جواب تو یہ ہے کہ "مفہومِ عدد" کا خلاصہ ہے: **"تعليق الحكم بعدد مخصوص"** (کسی حکم کو کسی مخصوص عدد پر معلق کرنا، یا کسی فضیلت کو کسی مخصوص عدد کے ساتھ مقید کر کے بیان کرنا)۔

یہ علی الاطلاق حجت ہے، یا مخصوص مواقع پر، یا معتبر ہے ہی نہیں؟ اِس سلسلے میں اُصولیین کے مختلف اقوال ہیں۔

اِمام نوویؒ تو "**فضل صلاة الجماعة**" کی روایات کے اختلاف کے تحت فرماتے ہیں:

ومفهوم العدد باطل عند جمهور الأصوليين۔ (شرح النووی علی صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۶۵۰)۔

مگر حافظ ابن حجرؒ کی تعبیر محتاط ہے، وہ فرماتے ہیں: **والتحقیق أن دلالة مفهوم العدد لیست یقینیةً، وإنما هي محتملة** (فتح الباری ۳/۱۲۵۰)۔

یہاں یہ واضح رہے کہ "مفہومِ عدد" کے اعتبار و عدمِ اعتبار کا یہ اختلاف اُن مواقع پر ہے جہاں حکم کو کسی خاص وصف یا علت کے ساتھ مقید کرنا مقصود ہو، جیسے "**خمس من الفواسق**" وغیرہ احادیث، اور جہاں پیشِ نظر صرف تکثیر و تفضیل ہی ہو، وہاں بالاتفاق یہ معتبر نہیں۔ **قلت: ومحل الخلاف عدد لم یقصد به التکثیر، کالألف، والسبعین** (الوجیز فی أصول الفقہ الإسلامی ۲/۱۶۲)۔

احقر عرض کرتا ہے کہ مسجدِ نبوی (علی صاحبہ الصلاۃ والسلام) میں فضیلتِ نماز سے متعلق اگرچہ بلحاظِ سند "ألف" والی روایتیں ہی صحیح ہیں، لیکن وہاں بظاہر "ألف" سے مراد تکثیر ہی ہے، تحدید نہیں، (کیوں کہ **واللّٰہ یُضَاعِفُ لِمَن یَشاءُ** کا قاعدہ تو ہر عمل اور ہر اَجر میں جاری ہوسکتا ہے)، اِس لیے وہ "خمسین ألف" والی روایات کے منافی نہیں، لہٰذا دونوں میں تعارض اور مخالفتِ تامہ کا ثبوت بھی نہ ہوا، بناء بریں اگر کوئی شخص بابِ فضائل پر نظر کرتے ہوئے "خمسین ألف" والی روایات کو بھی (باوجود ضعفِ سند کے) قبول کرے، اور مسجدِ نبوی کی ایک نماز کا ثواب "پچاس ہزار گنا" باور کرے تو اللہ کا فضل بہت وسیع ہے، اور اِس میں کوئی بات خلافِ اُصول نہیں ہے، بلکہ حضرت سفیانِ ثوریؒ سے منقول ہے کہ آپ سے سؤال کیا گیا کہ مسجدِ حرام کی نماز کا ثواب کتنا ہے؟ فرمایا: ایک لاکھ گنا، عرض کیا گیا: اور مسجدِ رسول کا؟ فرمایا: پچاس ہزار گنا... إلخ۔

اِس سے معلوم ہوا کہ فی الجملہ سلف کے ہاں بھی مسجدِ نبوی کے ثواب کی یہ فضیلت معہود و تسلیم شدہ تھی۔ **واللّٰہ تعالیٰ أعلم، وعلمه أتمّ وأحکم، سبحانَك، لا عِلمَ لنا إلا ما عَلَّمتَنا، إنك أنتَ العلیم الحکیم، وما توفیقي إلا بالله، علیه توکلت، وإلیه أنیب**۔

یہاں تک اَصل سؤالات کے جوابات بفضلہ تعالیٰ وحسنِ توفیقہ پورے ہوگئے، اَب تکملةً للموضوع واستطراداً للباب موقع کے مناسب علماء کے ذکر کردہ بعض اضافی فوائد بھی پیشِ خدمت ہیں:

فائدۂ اُولیٰ: اِن مساجد میں جس نماز کی فضیلت وارِد ہوئی ہے اُس سے کون سی نماز مراد ہے: فرض یا نفل، یا دونوں؟ اِمامِ طحاویؒ (وغیرہ بعض علماء) کی رائے ہے کہ یہ فرض کے ساتھ خاص ہے، نوافل اِس فضیلت میں شامل نہیں، اِس لیے کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ نبوی ہی میں تشریف رکھتے

ہوئے یہ بات فرمائی تھی: صلاةُ أحدكم في بيته أفضل من صلاته في مسجدي إلا المكتوبة (تم میں کسی کا اپنے گھر میں نمازیں پڑھنا میری اِس مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے، سوائے فرض نمازوں کے کہ وہ مسجد ہی میں ضروری ہیں)۔

اِس سے معلوم ہوا کہ نوافل کی اصل فضیلت گھر ہی میں پڑھنے میں ہے۔ طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہی حکم مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ کا بھی ہوگا (شرح مشکل الآثار ۲/ ۷۲)۔

مگر امام نوویؒ وغیرہ اکابر نے اس کو تسلیم نہیں فرمایا، اِس لیے کہ یہاں تقابل دوسری مساجد سے ہو رہا ہے، نہ کہ گھر وغیرہ دیگر مواضع سے، اِس لیے جب ''صلوٰۃ'' کا لفظ مطلق ہے تو سب ہی نمازوں کو عام ہوگا (شرح مسلم)۔

فائدۂ ثانیہ: اِسی پر مبنی یہاں دوسری بحث یہ ہے کہ اِضافۂ ثواب (ومضاعفتِ اَجر) کی یہ فضیلت صرف نماز کے ساتھ خاص ہے، یا صدقہ، روزہ اور ذکر واَذکار وغیرہ تمام عبادات کے لیے ہے، بعض روایات سے استدلال کرتے ہوئے علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ یہ تمام ہی عبادات کے لیے ہے (إعلام الساجد بأحکام المساجد ص ۱۲۶)۔

فائدۂ ثالثہ : تیسری بات یہ کہ یہ فضیلت صرف باعتبار اجر وثواب کے ہے، کفایت اور قضاء کے اعتبار سے نہیں بالاجماع، لہٰذا ایک نماز پڑھنے پر ثواب تو بڑھ کر ملے گا، مگر وہ نماز بہت سی قضاء نمازوں کی طرف سے کافی نہیں ہو جائے گی (طرح التثریب للولی العراقی ۶/ ۴۸، والمرقاۃ للقاری ۶۹۲)۔

فائدۂ رابعہ: چوتھی بات یہ کہ یہ فضیلت قدیم مسجدِ نبوی اور مسجدِ حرام کے ساتھ مخصوص ہے، یا جدید حصہ کو بھی عام ہے؟ مسجدِ نبوی کے بارے میں نوویؒ وغیرہ نے تو تصریح کی ہے کہ وہ اُسی قدیم حصہ کے ساتھ مخصوص ہے، پورے حرمِ مدینہ کے لیے عام نہیں ہے، اِس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''فی مسجدی ہذا'' کہہ کر اپنی اسی موجود اور معہود مسجد کی تعیین وتاکید فرمادی تھی، مگر اِس حصر وتحدید میں ابوزرعہ عراقیؒ کو تردد ہے (أنظر: ''طرح التثريب في شرح التقريب'' ۶/ ۴۶)، بلکہ علامہ ابن حجر ہیتمیؒ نے تو اِضافہ شدہ حصہ کے لیے بھی اِس فضیلت کا جزم ہی کیا ہے (فتح الإله شرح المشكوة ۶۹۲)، اور ملا علی القاری نے اِسی کو مختار قرار دیا ہے (مرقاۃ المفاتیح ۶۹۲)۔ واللہ اعلم

مسجدِ حرام کے سلسلے میں بھی علماء کے مختلف اقوال ہیں، علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں: **يتحصل في المراد بالمسجد الحرام الذي تُضاعَف فيه الصلاة سبعة أقوال: الأول: أنه المكان الذي يحرم على الجنب الإقامةُ فيه. الثاني: أنه مكة. الثالث: أنه الحرم. الرابع: أنه الكعبة. الخامس: أنه الكعبة وما في الحجْرِ من البيت. السادس: أنه الكعبة والمسجد حولها. السابع: أنه جميع الحرم وعرفة** (إعلام الساجد ص ۱۱۹)۔

یہ سات اقوال نقل کرنے کے بعد زرکشیؒ نے مختلف علماء کے حوالے سے اِس پر طویل بحث فرمائی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زرکشیؒ وغیرہ کے نزدیک یہاں "مسجدِ حرام" سے مراد کعبہ شریف اور اُس کے مخصوص ومحدود اَطراف ہی ہیں، پورا حرم نہیں۔

اِسی طرح ملا علی قاریؒ نے چار اقوال نقل فرمائے ہیں: اول حرم، دوم مسجدِ جماعت، اور اِسی کو حنفیہ کا قولِ مختار قرار دیا ہے، تیسرے پورا مکہ، چوتھے خاص کعبہ (مرقاۃ المفاتیح، رقم ۶۹۲)۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں... : **بخلاف المسجد الحرام، فإنه لا يختص بما كان أولاً هو المسجد، بل يَعُمُّ جميع الحرم الذي يَحْرم صيدُه على الصحيح، ذكره النووي وغيره.**

(قُوت المغتذی علی جامع الترمذی لسیوطی ۱/ ۱۵۳).

بندہ عرض کرتا ہے کہ اِس قول کی تائید اِس سے بھی ہوتی ہے کہ "مسندِ ابوداود طیالسی" (۱۴۶۴) میں رَبیع ابن صَبیح، عن عطاء بن ابی رباحؒ کے طریق سے حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کی ایک روایت ہے (جو مسند احمد وغیرہ کے حوالہ سے پہلے گذر چکی)، اُس کے آخر میں ہے کہ ربیع بن صبیح نے اپنے اُستاذ عطاء سے دریافت کیا: یا ابا محمد! اِضافہَ اَجر کی یہ مذکورہ فضیلت صرف مسجدِ حرام کے ساتھ مخصوص ہے، یا پورے حرم میں ہے؟ اِس پر عطاء نے فرمایا: **لا، بل في الحرم، فإن الحرم كله مسجدٌ** (نہیں، بلکہ پورے حرم میں ہے، اِس لیے کہ حرم پورا کا پورا مسجد ہے)۔

حافظ ولی الدین عراقیؒ نے لکھا ہے کہ "مسجدِ حرام" کا اِطلاق قرآن کریم میں چار معانی کے لیے ہوا ہے: ایک نفس کعبہ، دوسرے کعبہ اور اُس کے اِرد گرد، تیسرے جمیعِ مکہ، چوتھے جمیعِ حرم (طرح التثریب ۶: ۵۳)۔

فائدۂ خامسہ: مفسر ابوبکر نقاشؒ ایک لاکھ گُنے والی روایت کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

میں نے اِن نمازوں کے اجر وثواب کا حساب لگایا تو مسجدِ حرام کی ایک نماز کا ثواب: پچپن سال، چھ ماہ، بیس دن کی نمازوں کے برابر ہو گیا، اور ایک پورے دن کی (صرف فرض) نمازوں کا ثواب: دو سو ستہتر سال، نو ماہ، دس دن کے برابر ہو گیا (شرح القسطلانی علی البخاری ۲/ ۳۴۴)۔

اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اِن سب موعود فضائل وبرکات سے مستفیض ومستفید ہونے کا ذوق وشوق نصیب فرمائیں، اور اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائیں، اور اِن محرّرہ سطور کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر، ذخیرۂ آخرت بنائیں، آمین یا اَرحم الراحمین۔

ایک ذرہ کو قمر سے کوئی نسبت ہے کہیں

روح ایماں، روح دل، روحِ نظر، روح یقیں
رحمۃ للعالمیں ہیں وہ شفیع المذنبیں

خوب تر سے خوب تر ہے ارض طیبہ بالیقیں
اہل ایماں کے لیے ہے رشک فردوس بریں

ان کی عظمت کی شہادت خود ہے قرآن مبیں
مشک و عنبر سے بھی بالاتر ہے زلف عنبریں

نعت کہنے کے لیے مجھ میں تو قدرت کچھ نہیں
ایک ذرہ کو قمر سے کوئی نسبت ہے کہیں

اے خدا! عاصی ہوں میں، کچھ بھی نہیں فرد عمل
مشغلہ میرا بنادے نعت ختم المرسلیں

رات کا پچھلا پہر ہو، سوزش پیہم بھی ہو
آنسوؤں سے تربتر ہو میری دونوں آستیں

اے خدا! اس عارفؔ مہجور کی ہے آرزو
پھر دکھادے، ہاں دکھادے مجھ کو طیبہ کی زمیں

از حضرت مولانا فضل حق عارفؔ خیر آبادی

مطالعۂ قرآن　　　　چھٹی قسط

قرآن کریم میں مذکور تاریخی واقعات

مفتی عبداللہ سہارنپوری
متخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

ہابیل اور قابیل کا قصہ

حضرت آدم علیہ السلام کے حضرت حواء کے بطن سے ہر حمل میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتے تھے، اور حکم یہ تھا کہ ایک حمل کے لڑکے کا نکاح دوسرے حمل کی لڑکی سے کیا جائے، جڑوا بہن سے بھائی کا نکاح حلال نہ تھا، سب سے پہلے حمل میں ''قابیل'' اور اس کی بہن ''اقلیماء'' پیدا ہوئے اور دوسرے حمل میں ''ہابیل'' اور اس کی بہن ''البودہ'' پیدا ہوئے۔ قابیل کی بہن ''اقلیماء'' بہت خوبصورت تھی، اسی دستور کے مطابق حضرت آدمؑ نے ''ہابیل'' کی بہن کا ''قابیل'' کے ساتھ اور ''قابیل'' کی بہن کا ''ہابیل'' کے ساتھ نکاح کرنا چاہا، مگر قابیل راضی نہ ہوا اور کہنے لگا: میں اپنی بہن سے خود نکاح کروں گا، حضرت آدمؑ نے فرمایا وہ تیرے لئے حلال نہیں، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

حضرت آدمؑ نے حجت قطع کرنے کے لئے یہ فیصلہ فرمایا کہ تم دونوں اللہ کے نام کی نیاز اور قربانی کرو، جس کی نیاز خدا تعالیٰ قبول فرمائے گا اسی کے ساتھ ''اقلیماء'' کی شادی کردوں گا۔

چنانچہ دونوں نے قربانی کی، ''ہابیل'' نے جو مویشی اور بکریوں والا تھا، ایک عمدہ اور فربہ دنبہ قربان کیا اور پہاڑ پر لے جا کر رکھ دیا، اور ''قابیل'' نے جو کھیتی والا تھا، تھوڑا سا ردّی غلہ لا کر رکھ دیا، اس زمانے میں قبول اور عدمِ قبول کی نشانی یہ تھی کہ جو نیاز قبول ہوتی، اس کو آسمان سے ایک آگ آکر جلا جاتی، اور جو مقبول نہ ہوتی اس کے لئے آسمان سے آگ نہ آتی، جب ہابیل اور قابیل نے اپنی اپنی نیاز قربان گاہ پر لا کر رکھ دی، تو آسمان سے ایک آگ آئی اور ہابیل کی نیاز کو جلا گئی اور قابیل کی نیاز کو ویسے ہی چھوڑ گئی۔

غرض یہ کہ ہابیل کی نیاز قبول ہوئی اور قابیل کی نیاز قبول نہ ہوئی، تو قابیل کے دل میں حسد پیدا ہوا اور اپنے بھائی کے قتل کرنے کا ارادہ کیا، یہاں تک کہ اس کو قتل کر ڈالا، چونکہ اس سے پہلے کوئی انسان مرا نہ

تھا، اس لئے قتل کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کا کیا کرے جس سے یہ راز پوشیدہ رہے۔

اہلِ تاریخ کا بیان ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو عرصے تک اس کی لاش کو پشت پر لادے پھرتا رہا، کیونکہ یہ سب سے پہلی موت تھی جو روئے زمین پر واقع ہوئی تھی، اور اس وقت تک میت کو چھپانے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔

آخر اللہ تعالی نے دو کوّے بھیجے جو آپس میں لڑنے لگے اور ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا، پھر قاتل کوّے نے اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کرید کر اس میں ایک گڑھا بنایا اور مقتول کوّے کو اس میں ڈال کر مٹی سے چھپایا، قابیل نے یہ تمام کیفیات دیکھیں اور اس کوّے سے دفن کا طریقہ سیکھا، اور اپنی حالت پر سخت نادم اور شرمندہ ہو کر کہنے لگا: ہائے مری شامت! مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں اس کوّے جیسا ہی ہو جاتا، کہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا، ہائے کوّے کے برابر بھی مجھے عقل نہ آئی۔ (مائدہ ۲۷۔۳۰)

فائدہ: جاننا چاہئے کہ یہ ندامت اور پشیمانی توبہ کی ندامت نہ تھی، کیوں کہ جو ندامت خدا کے خوف سے ہو وہ "توبہ" ہے اور جو ندامت اور پشیمانی دنیا کی ذلت کے ڈر سے ہو، وہ ایک امر طبعی ہے وہ شرعی توبہ نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ دنیا میں جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اس کا گناہ حضرت آدمؑ کے پہلے بیٹے "قابیل" کی گردن پر ضرور ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتدا کی اور یہ ناپاک طریقہ جاری کیا۔

مقامِ عبرت

سورۂ مائدہ کی آیت اور حدیثِ مذکور ہم پر یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ: انسان کو اپنی زندگی میں ہرگز کسی گناہ کو ایجاد نہیں کرنا چاہئے، تاکہ وہ کل بدکاروں اور ظالموں کے لئے ایک نیا حربہ کا کام نہ دے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات میں جو شخص بھی آئندہ اس گناہ اور بدعت کا ارتکاب کرے گا تو بانیِ گناہ اور بدعت بھی برابر اس گناہ کا حصہ دار بنتا رہے گا، اور موجد ہونے کی وجہ سے ابدی ذلت اور خسران کا مستحق ٹھہرے گا، گناہ بہرحال گناہ ہے، لیکن گناہ کی ایجاد اس کے موجد کے لئے ہمیشہ کا وبال سر سے باندھ دیتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ (ملخصاً من قصص القرآن و معارف القرآن ادریسی)

حاصلِ مطالعہ — پہلی قسط

دفاعِ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالی

مفتی محمد جابر میواتی
استاذ شعبۂ تفسیر مظاہر علوم سہارنپور

اللہ تبارک وتعالی نے حفاظتِ دین اور اشاعتِ دین کا ایسا مضبوط نظام قائم فرمایا ہے کہ چودہ صدی گزرنے کے بعد آج بھی دینِ اسلام اور قرآن کریم اپنی اصل شکل وصورت پر قائم ودائم اور باقی ہے، معاندینِ اسلام کی لاکھ کوششوں کے باوجود اُس میں ایک حرف ونقطہ کا بھی تغیر نہیں ہوسکا۔ الفاظ کی حفاظت کا سہرہ تو قراء ومحدثین کے سر جاتا ہے، اور مفہوم ومطلب کی حفاظت کا تمغہ مفسرینِ قرآن وشارحینِ حدیث کو ملتا ہے، اور اِن دونوں کے مقصد وپیغام اور احکام کی حفاظت وصیانت کا گرانقدر کام فقہاء کرام نے انجام دیا ہے۔

حضراتِ فقہاء کی عظمت ورفعت کے سلسلہ میں علامہ نوویؒ نے ''المجموع'' کے مقدمہ میں ایک عنوان قائم کیا ہے: ''فصل في النهي الأكيد والوعيد الشديد لمن يؤذي أو ينتقص الفقهاء والمتفقهين، والحث على إكرامهم وتعظيم حرماتهم''، جس میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثِ مرفوع: ''مَن عادَى لي ولياً فقد آذَنته بالحرب'' (صحیح بخاری: رقم ۶۵۰۲) نقل کی، کہ ''جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میں اس سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں''۔

خطیب بغدادیؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے: ''إن لم يكن أولياء الله في الدنيا والآخرة الفقهاء والعلماء، فليس لله ولي'' (الفقیہ والمتفقہ - ۱/ ۱۵۰) کہ ''اگر دنیا وآخرت میں یہ علماء وفقہاء، اللہ کے ولی نہیں تو پھر اللہ کا کوئی ولی ہی نہیں ہے''۔

طبقۂ فقہاء کے سرخیل ہیں: سراج الآمۃ، سید الفقہاء، امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ تعالی، جن کے بارے میں عبداللہ بن مبارکؒ وغیرہ فرماتے ہیں: ''أفقه الناس أبو حنيفة، ما رأيتُ في الفقه مثلَه'' (تاریخ بغداد- ۱۳/ ۳۴۲) کہ ''امام ابوحنیفہؒ سب سے بڑے فقیہ ہیں، میں نے فقہ میں اُن جیسا کوئی نہیں دیکھا''۔

دنیا کا دستور رہا ہے کہ جو شخص جتنا عالی رتبہ وبلند مرتبہ ہوتا ہے، اُس پر رد وقدح اور اشکالات

واعتراضات بھی اُسی قدر ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ پر بھی ہر زمانہ میں متعدد علماء اور کئی مکاتبِ فکر کی طرف سے بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں، جن کے متعدد اسباب ووجوہات ہیں۔ وہیں علماء کی ایک بہت بڑی جماعت وہ ہے جس نے امام اعظمؒ کے فضائل ومناقب پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، اور امام صاحب کے دفاع میں متعدد کتابیں مرتب فرمائی ہیں، جن میں معترضین ومخالفین کے اعتراضات کے مفصل ومدلل جوابات دیے گئے ہیں۔

اجمالاً اُن اعتراضات واشکالات کے اسباب ووجوہات کو اِن چند باتوں میں منحصر کیا جاسکتا ہے:

اول: جہالت

امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت، عقائد اور مسائل کے سلسلہ میں بہت سے علماء تک صحیح اور حق بات نہیں پہنچ سکی، یا تو واسطہ در واسطہ ہو کر غلط باتیں پہنچیں، یا وہ باتیں پہنچیں جو بعض لوگوں نے امام پر گھڑ رکھی تھیں، حالانکہ اُن باتوں سے امام صاحب کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا، اِس لیے اُن علماء نے اپنا فرضِ منصبی ادا کرتے ہوئے اُن تک پہنچی ہوئی باتوں کے پیشِ نظر امام صاحبؒ پر کلام اور رد وقدح کی، ابن عبد البر مالکیؒ فرماتے ہیں: ”**كان أبو حنيفة يُحسَد ويُنسَب إليه ما ليس فيه، ويُختَلق عليه ما لا يليق به**“ (جامع بیان العلم وفضلہ ۲/ ۱۰۸۰)۔

ابوعبد اللہ صیمریؒ نے ”اخبار أبي حنیفہ ص ۸۵“ اور خطیب بغدادیؒ نے ”تاریخ بغداد ۱۳/ ۳۳۸“ میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ امام اوزاعیؒ نے امام صاحبؒ کی طرف منسوب چند مسائل کو ذکر کر کے اُن پر کچھ کلام کیا، جس پر ابن المبارک نے امام صاحب کا صحیح مسلک بتایا۔ اس کے کچھ دن بعد اِن دونوں حضرات کی مکہ مکرمہ میں امام صاحب سے ملاقات ہوئی، تو امام اوزاعیؒ نے وہ مسائل امام صاحب کے سامنے پیش کیے، جن کی امام صاحبؒ نے اور زیادہ توضیح کی، جس سے وہ بخوبی مطمئن ہو گئے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد ابن المبارکؒ سے فرمانے لگے: ”**غبطتُ الرجل بكثرة علمه ووفور عقله، وأستغفر الله تعالى، لقد كنتُ في غلط ظاهر، الْزَم الرجلَ فإنه بخلاف ما بلغني عنه**“ کہ ”امام ابوحنیفہ کی وسعتِ علمی اور کمالِ عقل پر مجھے رشک آنے لگا، میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں، میں صریح غلطی میں پڑا ہوا تھا، اِس شخص کو لازم پکڑلو، کیونکہ اِن کی شخصیت اور باتیں اُس کے برخلاف ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں“۔

دوم: حسد

مشہور شافعی عالم ابن حجر ہیتمیؒ ”الخیرات الحسان ص ۶۴“ میں امام صاحب کی طرف سے دفاع کرتے

ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''وقول بعض أعدائه فيه خلاف ذلك، منشأه الحسد'' کہ بعض مخالفین کا اُن پر کلام کرنا حسد کی وجہ سے تھا۔ ابن عبد البر مالکی نے ''جامع بیان العلم وفضلہ ۲/ ۱۱۱۳'' میں لکھا ہے کہ ابن المبارکؒ سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص امام صاحب کے بارے برا بھلا کہتا ہے، تو انہوں نے ابن الرقیات کا یہ شعر پڑھا:

حسدوك أن رأوك ما فضّلك الله بما فُضِلت به النجباء.

اسی طرح موفق مکیؒ نے ''مناقب ۲/ ۱۵'' میں یحیی بن معین کا واقعہ نقل کیا ہے، جس میں ہے:

حسدوا الفتى إذ لم ينالوا سعيه فالقوم أضداد له وخصوم.

عبد اللہ بن داؤد خریبیؒ فرماتے ہیں: ''**الناس في أبي حنيفة حاسد وجاهل، وأحسنهم عندي حالاً الجاهل**'' (تاریخ بغداد- ۱۳/ ۳۶۴)۔ کہ امام صاحب پر اعتراض کرنے والے دو طرح کے ہیں: حاسد اور جاہل، اور میرے نزدیک اُن میں اچھا جاہل ہے۔ (کیونکہ اُس کو کسی حد تک معذور سمجھا جاسکتا ہے)۔

لہذا اِس طرح کے کلام اور رد وقدح کا کوئی اعتبار نہیں، ابن عبد البر مالکیؒ فرماتے ہیں: ''**لا يُقبَل في حق من اتخذه جمهور الناس إماماً في الدين قولُ أحد من الطاعنين، لأن السلف قد سبق مِن بعضهم في بعض كلامٌ كثير في حال الغضب، ومنه ما حمل على الحسد**'' (جامع بیان العلم وفضلہ- ۲/ ۱۱۱۶)۔ کہ جس شخص کو عام لوگوں نے دینی امور میں امام تسلیم کرلیا ہو، اُس کے بارے میں لعن طعن کرنے والوں کی بات قابل قبول نہیں ہوگی، کیونکہ بسا اوقات کسی نے غصہ کی حالت میں کوئی رد وقدح کردی، اور بعض باتیں حسد کی وجہ سے صادر ہوگئی ہیں۔

سوم: معاصرت

ہم عصر لوگوں میں آپس میں منافرت ومخالفت عموماً پائی جاتی ہے، جس کی بناء پر بسا اوقات ایک دوسرے پر تبصرے اور اعتراضات وغیرہ کردیے جاتے ہیں، جن کا کوئی قوی اور اہم سبب نہیں ہوتا، اسی لیے محدثین نے معاصرین کے کلام کو بلاچوں وچرا قبول نہیں کیا، بلکہ خوب تحقیق وتفتیش کے بعد اگر معلوم ہوجائے کہ کلام اور اس کی منشا بالکل صحیح ہے، تو قبول کرلیا، ورنہ رد کردیا۔

چہارم: مذہبی ومسلکی اختلاف

عقیدہ یا مسلک کا اختلاف بھی بسا اوقات اِس طرح کا کلام صادر کرادیتا ہے، جس کی بہت سی نظائر

موجود ہیں، تو اُس کلام کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ تاج الدین سبکی شافعیؒ فرماتے ہیں: ’’إذا كانت هناك قرينة دالة يشهد العقل بأن مثلها حامل على الوقيعة فيه من تعصب مذهبي، أو منافسة دنيوية، كما يكون بين النظراء، حينئذ فلا يلتفت لكلام الثوري وغيره في أبي حنيفة ... ولو أطلقنا تقديم الجرح لَمَا سَلِمَ لنا أحدٌ من الأئمة، إذ ما من إمام إلا وقد طعن فيه طاعنون، وهلك فيه هالكون. قال ابن عبد البر :هذا باب غلط فيه كثيرون، وضَلّت فيه فرقة جاهلية لا تدري ما عليها في ذلك‘‘ (طبقات الشافعية-۱/۱۸۸)۔ کہ اگر قرائن سے معلوم ہو کہ اِس امام پر جو کلام کیا گیا ہے اُس کی وجہ مذہبی تعصب یا دنیوی چپقلش ہے، جیسا کہ معاصرین میں ہوتا ہے، تو اُس کا اعتبار نہیں ہے، لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں سفیان ثوریؒ وغیرہ کے کلام کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اگر اِس طرح کی جرح کا بھی اعتبار کرلیا جائے تو کوئی بھی شخص لعن طعن سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایسی بات ہے جس میں بہت سارے لوگ غلطی کرتے ہیں۔

پنجم: تدقیقِ فقہی

امام اعظمؒ کو اللہ تعالی نے قوتِ حافظہ کے ساتھ ساتھ بلا کی فہم وذکاوت عطاء فرمائی تھی، تفقہ فی الدین میں کمال مرحمت فرمایا تھا، اِس لیے عامۃً آپ کا کلام اتنا دقیق ہوتا تھا کہ ظاہری سطح کے لوگ اُس کو سمجھ نہیں پاتے، جس کی وجہ سے آپ پر اعتراض کرتے تھے، مشہور صوفی بزرگ شیخ عبد الوہاب شعرانیؒ اپنے شیخ سے نقل فرماتے ہیں: ’’قال سيدي علي الخواص: مدارك الإمام أبي حنيفة دقيقة، لا يكاد يطلع عليها إلا أهل الكشف من أكابر الأولياء‘‘ (المیزان الکبری-۱/۲۱۹)۔ کہ امام ابوحنیفہ کے مدارک بہت باریک ہوتے ہیں، عامۃً اُن پر اہلِ کشف بزرگ ہی مطلع ہو پاتے ہیں۔ موفق مکی نے امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ کے شاگرد ابوسلیمانؒ سے نقل کیا ہے: ’’كان عجباً من العجب، وإنما يرغب عن كلامه من لم يَقْوَ عليه‘‘ (مناقب-۲/۱۶۲)۔

آپ عجیب شخص تھے، آپ کے کلام سے وہی شخص بیزار ہوا ہے جس میں آپ کی بات سمجھنے کی طاقت نہیں تھی۔

آئندہ قسطوں میں اِن شاء اللہ امام صاحبؒ پر ہونے والے اعتراضات کا علمی وتحقیقی جائزہ لیا جائے گا۔

اصلاحِ معاشرہ

نرم مزاجی

مفتی عبدالماجد قاسمی مفتاحی
بھیرا ولید پور مئو

انسانی طبیعتیں نرمی وسختی دونوں کو لیے ہوئے ہوتی ہیں، قانونِ قدرت ہے کہ چیزیں نرمی سے ہی باہم جڑتی ہیں خواہ اشیاء ہوں یا قلوب، انسانوں کو انسانوں سے جوڑنا ہو یا ان کے رب سے یہ کام دل میں رحمت، رقت اور نرمی پیدا کیے بغیر ممکن نہیں۔

نرم مزاجی ایسی خوبی ہے جس کی بدولت انسانی رویے میں رحمت، شفقت، عفو ودرگزر اور بردباری جیسی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں جب کہ بے جا سختی سے انسان کی طبیعت میں بے رحمی، سنگ دلی اور ظلم وزیادتی جیسے معائب پیدا ہوتے ہیں، حقیقی نرمی دل کا نرم ہونا ہے، جب بندے کا قلب نرم ہوتا ہے تو اسے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، جس کی برکت سے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں نصیب ہوتی ہیں۔

نرم مزاجی اسلام میں نہایت پسندیدہ اخلاقی وصف ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس وصف کو مومنوں کے ساتھ خاص کیا ہے، احادیثِ مبارکہ میں بھی اس صفت کو ابھارنے پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ حدیثِ پاک میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ”جو شخص نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ ہر قسم کے خیر اور بھلائی سے محروم کر دیا گیا“ **مَن یُحرَم الرِفقَ یُحرَم الخَیرَ کُلَّه** (سنن ابی داود ۴۸۰۹)

اس حدیث میں تمام امور میں نرمی برتنے کی ترغیب ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ جو شخص سختی اور شدّت سے کام لیتا ہے وہ اپنے کاموں میں بھلائی سے محروم کر دیا جاتا ہے، آدمی کی سختی اور ترش روئی اسے دوسرے انسانوں سے دور کر دیتی ہے، وہ خیر اور بھلائی سے محروم ہو جاتا ہے جب کہ نرم مزاجی اور وسعتِ دل آدمی کے لیے خیر کی راہیں کھول دیتے ہیں اس لیے جو شخص خیر کا طالب ہے اسے اپنے اندر نرمی پیدا کرنی چاہیے تا کہ وہ خیر اور بھلائی حاصل کر سکے۔

نرم مزاجی ایک قلبی وصف ہے جو تمام انسانوں کو میسّر نہیں آتا اور یہ انسانوں کے فرق کے لحاظ سے

مختلف درجے میں پایا جاتا ہے، جن لوگوں کو نرمی کی صفت ملی انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑا انعام اور تحفہ ملا۔ نرم دل انسان صرف انسانوں سے نرمی نہیں برتتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات سے نرمی برتتا ہے۔

آپ ﷺ کو سراپا رحمت اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا، آپ کی طبیعت نرم تھی برتاؤ میں سختی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ لوگ آپ کی طرف رغبت اور شوق رکھتے اور جو آپ کے حلقے میں آجاتا پھر وہ آپ سے بھاگ کر دور نہیں جاتا تھا، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس وصف کا ذکر فرمایا: **فَبِمَا رَحمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُم وَلَو كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ القَلبِ لَانفَضُّوا مِن حَولِكَ**

اے پیغمبر! یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بڑے نرم مزاج واقع ہوئے ورنہ یہی اگر تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے نبی پاک ﷺ کے اخلاق میں پیدا کی اور یہ نرم مزاجی، خوش دلی اور رحیمانہ صفات ہیں جن کی بنا پر دل ان کی جانب لپکتے ہیں، لوگ ان سے الفت رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: **وَاخفِض جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ المُؤمِنِينَ**

اور ایمان والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ یعنی ان سے نرمی برتیے اور اپنے بازوؤں کو ان کی جانب جھکا دیجئے۔

یہ نرمی، تواضع اور جھکنا بالکل اسی طرح جیسے پرندہ اپنے پر سمیٹ لیتا ہے تو زمین پر اتر جاتا ہے،

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نرمی جس چیز میں ہوتی ہے اسے آراستہ کر دیتی ہے اور جس چیز سے نرمی الگ کرلی جاتی ہے اسے بدنما بنا دیتی ہے (صحیح مسلم باب الرّفق ۲۹۴)۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں ایسے لوگوں کی خبر نہ دوں جو جہنم کی آگ پر یا جہنم کی آگ ان پر حرام ہے؟ لوگوں کے قریب رہنے والے، آسانی کرنے والے اور نرم اخلاق والے پر جہنم کی آگ حرام ہے (سنن ترمذی ۲۴۸۸)۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نرمی کرتا ہے اور سارے کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے، (سنن ابن ماجہ کتاب الادب ۳۶۸۹)۔

حضرت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے اندر ''اَلرِّفقُ فِي الاَمرِ کُلّه'' کے عنوان سے ایک باب قائم کیا اوراس کے تحت دوروایت ذکر فرمائی، پہلی روایت امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: یہود کی ایک جماعت آپ ﷺ کے پاس آئی اور کہا السام علیکم (معاذ اللہ آپ پر موت طاری ہو) حضرت عائشہؓ کہتی ہے میں نے کہا نہیں بلکہ تم لوگوں پر خدا کی موت اور پھٹکار ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایااے عائشہؓ! اللہ تعالیٰ بلاشبہ ہر بات میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے کہا یارسول اللہ! آپ نے سنانہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا (میں نے سن لیا اوراس کے جواب میں صرف اتنا کہا) **وعلیکم** یعنی تم پر بھی۔(صحیح بخاری ۶۰۲۴)۔

دوسری روایت حضرت انس ابن مالکؓ سے مروی ہے جس میں ایک اعرابی کا واقعہ ذکر ہے جس نے مسجد نبوی ﷺ میں پیشاب کرنے لگا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روکنے کے لیے کھڑے ہوئے یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایااس کا پیشاب مت روکو، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ایک ڈول پانی منگوایااوراس پر بہادیا، (ایضاً ۶۰۲۵)۔

محدّثِ جلیل حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) مذکورہ حدیث کی اہمیت اورضرورت پررقم طراز ہیں:

> نرمی اور سختی بہت وسیع ہے، اپنے گھر والوں سے، بیوی بچوں سے، غریب و قریب سے، پڑوسیوں اور شاگردوں سے، حاکموں اور افسروں سے سب سے اس کا تعلق ہے، آدمی کوزندگی میں جن جن سے سابقہ پڑتا ہے ان سب کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے یہ بات خوداس کے لیے بھی باعثِ رحمت ہے اور دوسروں کے لیے بھی سکون کا سبب ہے، نرمی کرنے سے باہم مودت ومحبت پیدا ہوتی ہے اکرام واحترام اورخیرخواہی کے جذبات ابھرتے ہیں اورسخت رویہ اختیار کرنے سے آپس میں بغض وعداوت پیدا ہوتی ہے حسد اور بدخواہی اور جنگ وجدال کے جذبات ابھرتے ہیں۔(تحفۃ الالمعی ۵/ ۳۴۵)

قرآن وحدیث کے اندر مزید بہت سی جگہوں میں نرم مزاجی کے تعلق سے مومن کوابھارا گیااوراس کے فوائد وثمرات بیان کئے گئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نرمی، خوش دلی اور بردباری خداوندقدوس کی طرف سے کتنی عظیم نعمت ہے۔

آج ہمارے ماحول اور معاشرے میں نرمی کی جگہ بیجا سختی نے لے لی ہے جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد میں خیر خواہی، خداترسی اور حسنِ سلوک کا جذبہ مفقود نظر آتا ہے، ہر جانب طبیعتوں کی قساوت کی وجہ سے معاشرے کا حسن گہنا رہا ہے، انسانوں کے باہمی تعلقات میں سختی اور سنگ دلی بڑھتی جارہی ہے، اخلاقی نرمی اور حلم وبردباری غائب ہوتی جارہی ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ دل کو نرم کیا جائے کیوں کہ دل انسانی اعضاء کا بادشاہ ہے جب یہ نرم ہوگیا تو آپ کے کردار، گفتار اور اطوار میں خود ہی نرمی پیدا ہوجائے گی، موت کو یاد کیا جائے گناہوں سے بچا جائے یہ سب دل کو نرم کرتے ہیں۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں اس طرح کی بے شمار واقعات ملیں گے کہ نرم مزاجی اور نرم رویہ کی وجہ سے کفر کے بڑے بڑے ائمہ پاسبانِ اسلام بن گئے۔

زندگی کے تمام معاملات میں نرمی کا برتاؤ اور بردباری کا معاملہ ہونا چاہیے، اپنے گھر والوں، پڑوسیوں، رشتے داروں، اجنبیوں، شاگردوں، خادموں، حاکموں، افسروں، تاجروں اور دوست و احباب وغیرہ ہر ایک سے اس کا تعلق ہے، ذاتی وخاندانی معاملات ہوں، آپسی گفتگو ہو، احکامِ شریعت کا نفاذ ہو، باہمی لین دین کا معاملہ ہو، اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کی قیادت ہو ان سب امور کی انجام دہی میں نرمی، شفقت اور دل نوازی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ قرآن پاک میں ”وَلیَتَلطَّف“ کا مفہوم بھی اسی طرح کا ہے کہ ہر معاملے میں نرم رویہ ہونا چاہیے، عربی زبان کا محاورہ ہے ”لِینُ الکَلَامِ قَیدُ القُلُوبِ“ نرم بات دلوں کی بیڑی ہے، پیار سے تو پتھر دل بھی موم ہوجاتا ہے۔

ہمیں اپنے اندر نرم رویہ کو پروان چڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے اور غیر ضروری تنقید اور تضحیک جس سے کسی کی دل آزاری کا خدشہ ہو اس سے پرہیز کرنا چاہیے شاید اس طرح سے ہم پُرسکون زندگی کی طرف اپنی کوششوں کا آغاز کرسکیں اور یہی روایت انسان دوستی کی طرف ہماری رہنمائی کر سکے گی، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تبرکاتِ اکابر

ملفوظات

از فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی مفتی اعظم ہند

مرتب: مولانا مفتی شعیب احمد بستوی
معین مفتی دارالافتاء مظاہر علوم سہارنپور

ارشاد فرمایا کہ: لڑکی والے لڑکے (داماد) کو جو کچھ دیتے ہیں وہ تملیکا (مالک بنانے کیلئے) دیتے ہیں، عاریۃً نہیں دیتے، اور وہ جہیز نہیں ہوتا، اس لئے طلاق ہو جانے پر لڑکی والوں کو اس کے مطالبہ کا حق نہیں۔ جہیز تو وہ ہوتا ہے جس کو لڑکی والے اپنی لڑکی کو دیتے ہیں، وہ لڑکی کا ہوتا ہے، اس لئے بوقت طلاق اس کو واپس لینے کا حق ہے، لڑکے والوں کو اس کو رکھنے کا حق نہیں۔

ارشاد فرمایا کہ: اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا ہے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کل مدتِ حیات میں مسلمان شہداء اور کفار مقتولین کی تعداد ایک ہزار کو بھی نہیں پہونچتی۔ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کے دس سالہ قیام کے دوران کتنے ہی غزایا اور کتنے ہی سرایا کئے۔

پھر فرمایا کہ مشہور انگریز مؤرخ ٹامس کارلائل کا قول ہے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ شمشیر چلانے والوں کو کس شمشیر کے ذریعہ مسلمان کیا گیا تھا۔

پوچھا گیا کہ اگر کسی عورت کے دنیا میں متعدد شوہر ہوئے، وہ اور اس کے شوہر بھی جنتی ہوں تو وہ عورت جنت میں کس شوہر کو ملے گی؟ فرمایا کہ اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ آخری شوہر کو ملے گی۔ دوسرا قول ہے کہ اس کو اختیار دیا جائے گا وہ جس کو چاہے اختیار کرے، دونوں قول بستان فقیہ ابواللیث میں مذکور ہیں۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ جب جنت میں ایک دوسرے سے ملاقات کے لئے جائے گا تو کیا اس کے پاس ایک دورات کے قیام کی اجازت ہوگی۔ تو ارشاد فرمایا کہ جنت میں رات ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ طلوع آفتاب سے ذرا پہلے جیسا سہانا وقت ہوتا ہے ویسا ہی جنت میں ہوگا۔

ارشاد فرمایا کہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادوں میں ذبیح کون تھے، اس میں

اختلاف ہے، دونوں طرف علماء گئے ہیں، بعض نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح کہا ہے اور بعض نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو۔مگر مشہور اور راجح یہ ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اگر چہ بنی اسرائیل حضرت اسحٰق علیہ السلام کو کہتے ہیں۔

قول اول کے ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بنی اسماعیل سے ہونا اجماعی ہے۔دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے أنا ابن الذبیحتین میں دو ذبیح کا بیٹا ہوں۔ان ذبیحین میں سے ایک تو آپ کے والد ہیں بالاجماع (جن کا پورا واقعہ کتب سیر وتاریخ میں مذکور ہے) اور دوسرے ذبیح اسماعیل علیہ السلام متعین ہیں، ورنہ آپ کا یہ قول بنی اسماعیل سے ہونے کے معارض ہوگا۔

(اضافہ ازمرتب: شامی نعمانیہ ۱ / ۵۶۳ میں دونوں قول مذکور ہیں، اور بہت مدلل اور قوت کے ساتھ قول اول کو ثابت کیا گیا ہے، من شاء فلیراجع)

ارشاد فرمایا کہ: ایک مرتبہ مصر سے فارغ شدہ مشائخ کی جماعت حنفیہ کے اس قول میں اُلجھ گئی کہ اگر کسی شخص میں ننانوے وجوہ کفر کی ہوں۔اور ایک وجہ ایمان کی ہو تو اس کی تکفیر نہ کی جائے۔وہ لوگ اس کا مطلب یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر کسی شخص میں ننانوے چیز کفر کی اور ایک چیز کفر کی نہ ہو تو اس کی تکفیر کی جائے۔ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بتلایا کہ اس کا مطلب وہ نہیں جو آپ نے سمجھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے کلام کی نناوے توجیہہ کفر کی ہوسکتی ہوں اور ایک توجیہہ کفر کی نہ ہوسکتی ہو تو اس کی تکفیر نہ کریں گے۔

ارشاد فرمایا کہ: ایک شخص تمبا کو کو خریدنے دوکان پر گیا، دوکاندار سے کہا تمبا کو دکھاؤ دوکاندار نے تمبا کو دکھلا دیا، اس نے کہا کہ اس سے کڑوا دکھلاؤ، اس نے دکھلا دیا، کہنے لگا ان سب سے کڑوا دکھاؤ، اس نے دکھا دیا، اب کہنے لگا بہت زیادہ کڑوا دکھاؤ، تو دوکاندار نے کہا کہ ان سب سے زیادہ کڑوا رب کا نام ہے۔

اب بتلاؤ کہ کیا اس دوکاندار کو کافر کہیں گے کہ اس نے رب کے نام کو کڑوا بتلا دیا۔

فرمایا ہر گز نہیں اس لئے کہ کڑوا ہونا تمبا کو میں صفت کمال ہے، بس رب کے نام کو کڑوا بتلانے کے معنی ہیں کہ سب سے زیادہ صفت کمال حق تعالیٰ شانہ میں ہے، تمبا کو میں تو صرف اتنا ہی کڑواپن (صفت کمال) ہے جو دکھلایا گیا، تمبا کو اس سے زیادہ کڑوا نہیں ہوتا۔

واقعات الفتاویٰ

فتاویٰ مظاہر علوم

مفتی بشیر احمد سہارنپوری
نائب مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

اموالِ زکوٰۃ اوران کی مقداریں

زکوٰۃ مخصوص اموال میں واجب ہوتی ہے اور اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ ایک معینہ مقدار (نصاب) کو پہونچ جائیں، وہ مخصوص اموال اوران کی معینہ مقداریں ذیل میں درج ہیں:

(الف) ۸۷رگرام ۴۸۰رملی گرام سونا۔جس کی مقدار مروجہ دس گرام کے تولہ کے اعتبار سے تقریباً پونے نوتولہ بنے گی۔

(ب) ۶۱۲رگرام ۳۸۰رملی گرام چاندی۔جس کی مقدار مروجہ دس گرام کے تولہ کے اعتبار سے تقریباً سوااکسٹھ تولہ ہوگی۔

(ج) سونے یاچاندی کی مذکورہ مقدار کے برابر نقدروپیہ یا کوئی بھی کرنسی۔

(د) سونے یاچاندی کی مذکورہ مقدار کے برابر مالِ تجارت یابیچنے کی نیت سے خریدی گئی کوئی بھی چیز۔

(ہ) یہ تمام اموال یاان میں سے کچھ اموال مذکورہ مقدار سے کم ہوں، مگران کی مجموعی مالیت سونے یا چاندی کی مذکورہ مقدار کے برابر ہوتو بھی زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔

واضح رہے کہ سوناچاندی زیور کی شکل میں ہوں یاکسی اورشکل میں، استعمال کے لئے ہوں یاتجارت کے لئے، یابچوں وغیرہ کودینے کے لئے، ان میں بہر صورت زکوٰۃ واجب ہوگی، اسی طرح نقدرقم پربھی بہر صورت زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ کسی ضرورت کے لئے رکھی ہوئی ہو، نیز بیچنے کی نیت سے خریدی گئی ہر چیز پرزکوٰۃ واجب ہوگی، بشرطیکہ بیچنے کی نیت تاحال باقی ہو۔

وجوبِ زکوٰۃ کی شرطیں

زکوٰۃ کے وجوب کے لئے چند شرائط کاپایاجانا ضروری ہے، جس شخص میں وہ شرائط موجود ہوں اُسی

پر زکوٰۃ واجب ہوگی، زکوٰۃ کے وجوب کی بنیادی شرائط یہ ہیں:

(الف) بالغ ہونا۔ نابالغ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(ب) عاقل ہونا۔ غیر عاقل اور مجنون پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(ج) مخصوص اموال کی معینہ مقدار پر ملک تام حاصل ہونا۔ ملک تام سے مراد ہے کہ وہ مخصوص اموال ملکیت کے ساتھ قبضہ میں بھی آچکے ہوں، مخصوا اموال کی تفصیل اوپر ذکر کی جا چکی ہے۔

(د) مخصوص اموال کی معینہ مقدار کا قرض سے فاضل ہونا۔ لہٰذا جس شخص کے پاس مخصوص اموال کی معینہ مقدار ہو مگر اتنا ہی قرض بھی ہو، یا قرض ادا کرنے کی صورت میں معینہ مقدار سے کم مال بچتا ہو تو ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(ہ) مخصوص اموال کی معینہ مقدار پر سال گزر جانا۔ سال گزرنے کا مطلب دو باتیں ہیں:

۱ــ سال کے اول و آخر میں مخصوص اموال کی فرداً فرداً یا مجموعی لحاظ سے معینہ مقدار مکمل ہو۔

سال کے اول سے مراد وہ پہلا دن ہے جس دن مخصوص اموال کی معینہ مقدار ملک میں آئی ہو، اور سال کے آخر سے مراد وہ آخری دن ہے جس دن مخصوص اموال کی معینہ مقدار کے مالک بننے کے دن سے قمری سال مکمل ہو۔

۲ــ پورے سال مخصوص اموال کی معینہ مقدار کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی رہے۔

مذکورہ چاروں قسم کے مخصوص اموال شریعت میں ایک جنس شمار ہوتے ہیں، اس لئے کسی بھی قسم کے مال کے کچھ حصہ کا باقی رہنا وجوبِ زکوٰۃ کے لئے کافی شمار ہوگا۔

اس تفصیل کے مطابق جو شخص سال کے اول و آخر میں مخصوص اموال کی فرداً فرداً یا مجموعی لحاظ سے معینہ مقدار کا مالک ہو، اور پورے سال ان تمام مخصوص اموال میں سے کچھ نہ کچھ اس کے پاس موجود رہا ہو تو کہا جائے گا کہ یہ شخص سال بھر صاحبِ نصاب رہ، اور اس کے مال پر سال گزر گیا، چاہے اس میں کمی بیشی ہوتی رہی ہو، لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس کے پاس مذکورہ مخصوص اموال میں سے جو بھی اموال ہوں سب کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

سال گزرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ مخصوص اموال کی معینہ مقدار سال بھر جمع رہی ہو، اور نہ مذکورہ مخصوص اموال میں سے ہر ایک پر الگ سال گزرنا ضروری ہے، جیسا کہ عوام الناس کا خیال یہی ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ

زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے اولاً اپنے پاس موجود اموال کا جائزہ لیا جائے، اس جائزہ میں درجِ ذیل

امورانجام دیئے جائیں۔

۱۔جن مخصوص اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ان میں سے جو جو اموال ملکیت میں موجود ہوں ان کی مقداروں کو نوٹ کرلیا جائے ،خواہ وہ سال بھر سے جمع ہوں یا ادائیگئ زکوٰۃ کی تاریخ سے چند ماہ یا چند روز قبل ملکیت میں آئے ہوں۔

۲۔مخصوص اموال میں سے جو مال کسی کو قرض یا دَین کے طور پر دیا ہوا ہو اور اس کی وصولیابی کی امید ہو،اس کی مقدار بھی نوٹ کرلی جائے۔

۳۔لوگوں کے جن قروض و دیون کی ادائیگی ذمہ میں ہو،ان کو مذکورہ دونوں مقدار کے مجموعہ سے منہا (minus) کردیا جائے۔

اِن تینوں امور کی انجام دہی کے بعد جو مال باقی بچے اگر وہ مذکورہ معینہ مقدار (نصاب) کے بقدر یا اس سے زیادہ ہوتو اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ کے طور واجب ہوگا۔

زکوٰۃ کے مصارف

زکوٰۃ جیسے مخصوص اموال میں واجب ہوتی ہے ،ایسے ہی وہ مخصوص افراد کو مخصوص طریقہ پر دینا ضروری ہے،اس کے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی ،وہ مخصوص افراد یہ ہیں:

۱۔مسکین۔یعنی وہ شخص جس کے پاس کچھ بھی مال نہ ہو۔

۲۔فقیر۔یعنی وہ شخص جس کی ملکیت میں ضرورت سے فاضل بالکل مال نہ ہو یا معینہ مقدار سے کم ہو۔

۳۔مقروض و مدیون۔

۴۔مسافر۔جو سفر کے دوران ضرورت مند ہوجائے۔

قرآن کریم نے ان کے علاوہ چار مصارف اور ذکر کئے ہیں جو اس وقت یا تو معدوم ہیں یا ان کا وجود نادر ہے۔

اور مخصوص طریقہ سے مراد یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم مالک بنا کر ان افراد کے زکوٰۃ کی نیت سے حوالہ کی جائے ،اور یہ حوالگی بلا معاوضہ ہو،چنانچہ اگر ان افراد کی ضرورتوں میں از خود زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جائے گی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی،اسی طرح اگر زکوٰۃ کی نیت کے بغیر ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جائے تب بھی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی،نیز اگر کسی خدمت کے معاوضہ میں ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جائے اس سے بھی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

اخبار مظاہر

جمع وترتیب: عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی شوریٰ کا اجلاس

مدرسہ مظاہر علوم کی شوریٰ کا اجلاس حسبِ معمول منعقد ہوا، اجلاس کی صدارت حضرت حکیم محمد کلیم اللہ علی گڑھی نے کی اور اجلاس کا آغاز مدرسہ کے استاذ مولانا قاری سید محمد عمار ہاشمی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، مدرسہ کے سابق سکریٹری مولانا سید محمد شاہد الحسنی کے انتقال کے بعد یہ پہلی میٹنگ تھی تمام ارکان مجلس نے اس موقع پر مولانا سید محمد شاہد الحسنی کی کمی کو شدت سے محسوس کیا، مولانا سید محمد شاہد الحسنی کے سانحۂ ارتحال پر ان کے لئے تجویز تعزیت منظور کی گئی اس کے بعد مدرسہ کے عارضی سکریٹری مولانا سید محمد صالح الحسنی نے ایجنڈہ کے مطابق شوریٰ کی کارروائی چلائی، سب سے پہلے سابقہ کارروائی کی خواندگی ہو کر اس کی توثیق کی گئی، ایجنڈہ کے مطابق مدرسہ کے مستقل امین عام (سکریٹری) کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا، اتفاق رائے سے مولانا مفتی سید محمد صالح کو مستقل طور سے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا سکریٹری منتخب کرلیا گیا اور ارکان شوریٰ نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ سکریٹری مدرسہ کے ساتھ ساتھ نائب ناظم کا ان کا عہدہ برقرار رہے گا اور وہ امور نظامت حسبِ سابق انجام دیتے رہیں گے۔

اساتذہ وملازمین کیلئے نیا اسکیل گریڈ منظور ہوا، اور ماہِ اپریل (شوال کی تنخواہ) سے اس کا نفاذ ہوگا۔

مدرسہ مظاہر علوم کے لئے وقف شدہ جائدادوں کی نگرانی اور ان کی قانونی طور پر دیکھ ریکھ کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جو تمام جائیدادوں کے تحفظ اور ترقی کے لئے کوشش کرے گی۔

مدرسہ کے استاذ حدیث مولانا محمد یوسف گجراتی کو مدرسہ کا صدر مدرس منتخب کیا گیا۔

مدرسہ کے سکریٹری مولانا مفتی سید محمد صالح نے تمام تعلیمی شعبوں کی رپورٹ پڑھ کر سنائی، مجلس شوری نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور پیش کی گئی سفارشات کو منظوری دی۔

مدرسہ کے زیر انتظام جاری مکاتب دینیہ کی رپورٹ کی سماعت کے بعد مجلس شوریٰ نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور مکاتب کے ناظم مولانا مفتی سید محمد صالح نے تمام مکاتب کے لئے پانچ سالہ تعلیمی نصاب مرتب کر کے پیش کیا جس کے نفاذ کے لئے شوریٰ نے منظوری دی۔

مالیاتی سال ۲۰۲۲۔۲۰۲۳ء کی آڈٹ رپوٹ کی سماعت کے بعد اس کی توثیق کی گئی۔

اس اجلاس شوریٰ میں جناب حکیم محمد کلیم اللہ علی گڑھ، مولانا روح الحق تمل ناڈو، جناب الحاج ابراہیم منیار سورتی، مولانا محمد عارف ابراہیمی، الحاج سلامت اللہ دہلی، مولانا عبدالقوی حیدرآباد، مولانا مفتی خواجہ محمد معصوم رائے چوٹی، مولانا مفتی سبیل احمد وانمباڑی، مولانا سید محمد ساجد کاشفی سہارنپور، مولانا مفتی سید محمد صالح سہارنپور اور مولانا سید محمد عاقل (بحیثیت ناظم مدرسہ) نے شرکت کی۔

صدر مجلس جناب الحاج حکیم محمد کلیم اللہ علی گڑھ کی دعا پر اجلاس کا اختتام ہوا۔

حضرت ناظم صاحب مدظلہ کا سفر عمرہ

مدرسہ کے ناظم و شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب سالانہ امتحان کے بعد عمرہ کے لئے حرمین شریفین کے سفر پر گئے، ساتھ میں نائب ناظم مولانا سید محمد جعفر صاحب و دیگر حضرات رہے، ۱۶ر رمضان میں بعافیت واپس تشریف لائے۔

مدرسہ کی مسجد میں اعتکاف

رمضان ۱۳۸۵ھ/ دسمبر ۱۹۶۵ء سے مظاہر علوم کی مسجد میں پورے ماہ کے اعتکاف کا معمول جاری ہے، امسال بھی ملک کے گوشہ گوشہ سے سیکڑوں لوگ ماہ مبارک کے اعتکاف کے لئے مظاہر علوم تشریف لائے، اور خانقاہ خلیلیہ کا پورا انظام حضرات اکابر (حضرت شیخ محمد زکریا مہاجر مدنیؒ، پیر طریقت مولانا محمد طلحہ کاندھلویؒ، مولانا سید محمد سلمانؒ) کے معمولات کے ساتھ خانقاہ کے پیر مولانا سید محمد عثمان ابن مولانا سید محمد سلمان نے پورے کرائے، روزانہ کی مجلس وعظ میں مظاہر علوم کے صدر مفتی مولانا مفتی مقصود احمد، مفتی محمد طاہر، نائب ناظم مولانا مفتی سید محمد صالح، نائب مفتی مولانا مفتی بشیر احمد و دیگر اساتذہ عظام اور مہمانانِ کرام کے بیانات ترتیب کے مطابق پورے ماہ ہوتے رہے جس سے خلقِ خدا کو کافی فائدہ ہوا۔ عشرۂ اخیر کی طاق راتوں میں شہر و قرب و جوار کے لوگوں کا کافی مجمع تہجد، عبادت اور ذکر و اذکار کے لئے یہاں موجود رہا۔

پورے ماہ اعتکاف کرنے والے مہمانوں کا اوسط دو سو کے قریب رہا۔

اسی طرح مدرسہ کے ناظم و شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب مدظلہ نے مسجد شیخ محمد عاقل کھاتہ کھیڑی میں آخری عشرہ کا اعتکاف فرمایا، حضرت ناظم صاحب کے مریدین و متوسلین نے کافی تعداد میں شرکت کی اور تمام معمولات سالِ گذشتہ کی طرح بحسن وخوبی پورے ہوئے۔

R.N.I. REGD. NO. 62469/95U.M.
URDU MONTHLY MAGAZINE

MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR







Rs. 30/-

MADRASA MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR-247001 (U.P.) INDIA, PH. 0132-2655542
E-Mail: jamiamazahir@gmail.com

Printed By: AL-FAZL Computer +91-9358209995